Sharjeel Ahmed
تعلیم و تربیت
سالنامہ
مئی 1994ء

Sharjeel Ahmad Wasi
Date
No.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السّلامُ علیکُم

لیجیے، یہ رہا آپ کے تعلیم و تربیت کا سال نامہ۔ کسی پُر سکون جگہ بیٹھ کر، نہایت اِطمینان سے، شروع سے آخر تک پڑھیے، اور پھر ہمیں بتائیے کہ یہ آپ کی توقع پر پُورا اُترا یا نہیں۔ ویسے ہم نے تو اپنی طرف سے اِسے دل چسپ اور مزے دار بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اور ہمیں پُوری اُمّید بلکہ یقین ہے کہ آپ اِسے ضرور پسند کریں گے۔

اِس مہینے کی 22 تاریخ کو عیدُالاضحیٰ ہے۔ آپ کو خوشیوں بھرا یہ تہوار بہت بہت مُبارک ہو۔

عیدُالاضحیٰ کو عیدِ قُربان یا بڑی عید بھی کہتے ہیں۔ مسلمان یہ عید حضرت اِبراہیم علیہِ السّلام کی اُس عظیم قربانی کی یاد میں مناتے ہیں جو اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا و خوش نودی کی خاطر اُس کے حضور پیش کی تھی۔ مسلمان اِس تہوار پر حلال جانور ذِبح کر کے حضرت اِبراہیم علیہِ السّلام کی اِسی سُنّت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

قربانی ہر اُس مسلمان پر واجب ہے جو صاحبِ نصاب ہے یعنی جو زکوٰۃ دیتا ہے۔ قربانی کے گوشت کے تین حصّے کرنے چاہئیں۔ ایک حصّہ قربانی کرنے والا خود رکھ لے، ایک حصّہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں میں بانٹے اور ایک حصّہ غریبوں میں تقسیم کرے۔

اس شمارے میں

اداریہ		1
ہماری چڑیا (نظم)	عبدالرحمن	2
ایک تھا شہزادہ (کہانی)	سلیم احمد صدیقی	3
واہ واہ سبحان اللہ (کہانی)	ذکیہ بلگرامی	8
بچپن (کہانی)	سید نظر زیدی	12
پھلوں کا جادو (نظم)	فرحت شاہجہان پوری	17
پنچ رانی (تصویری کہانی)		18
قربانی کا اصل مقصد (درس قرآن)	ڈاکٹر عبدالرؤف	20
رحمان کے بندے کون ہیں؟	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	21
دوسرا فرض (کہانی)	حمزہ ادیب	23
نظر کا دھوکا		26
قیمت (کہانی)	اشتیاق احمد	27
شمالی امریکا (مضمون)	سعید لخت	30
شریف آدمی (کہانی)	محمد یونس حسرت	33
اندھی زمین کا سفر (کہانی)	محمد ادریس قریشی	40
پھول کو بھی (نظم)	ناصر زیدی	46
ناراض دولت (کہانی)	عفت گل اعزاز	47
سیر کو سوا سیر (کہانی)	مبارزم	51
نصرت (کہانی)	فاروق حسن	55
علمی آزمائش		57
آپ بھی دوست بنائیں		59
میں ہوں پاکستانی بچہ (نظم)	محمد عارف قریشی	60
سائنس کے کھیل		61
جب بنے مسالے دار		62
آپ کا خط ملا		
آپ بھی مسکرائیں		
آپ بھی لکھیے		
موت کی دیوار (کہانی)	سلیم خان گمی	
بلا عنوان کارٹون		
عظیم مسلمان (علامہ اقبال)	میاں الحق	

54 واں سال

دوسرا شمارہ

تعلیم و تربیت

...ان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

...ایڈیٹر: عبدالسلام
سعید لخت
...ینر و ڈرائنگ: سید شوکت اعجاز
...یشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
ظہیر سلام
عبدالسلام

پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت
3۔ شارع بن بادیس لاہور
6361309-6361310
6278815-6278816

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
60۔ شاہراہ قائدِ اعظم لاہور

سالانہ قیمت
...میں (صرف جنتری کے ساتھ) -/225 روپے
...مشرقِ وسطیٰ، افریقہ (ہوائی ڈاک سے) -/435 روپے
...یورپ (ہوائی ڈاک سے) -/625 روپے
...امریکا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) -/650 روپے

مئی 1994

قیمت فی پرچہ -/12 روپے

Sharjeel Ahmed

پیاسی چڑیا

سناتا ہوں اِک پیاسی چڑیا کا حال　　جسے پیاس نے کر دیا تھا نڈھال

وہ گرمی تھی، چھایا ہوا تھا غبار　　ترستے تھے بارش کو سب جان دار

اُڑی دیر تک وہ اِدھر سے اُدھر　　کہیں اُس کو پانی نہ آیا نظر

کبھی شہر بھر میں وہ اُڑتی پھری　　کبھی گاؤں کی سمت اُڑ کر گئی

تھکی ہاری پہنچی کنوئیں کے قریب　　وہاں بیل سوئے پڑے تھے غریب

کنوئیں سے کوئی پانی لیتا نہ تھا　　کہ ماحول سارا تھا سُونا پڑا

کیا پھر جو رُخ ایک تالاب کا　　وہاں خشک مٹّی تھی اور کچھ نہ تھا

بچاری بہت ہی پریشان تھی　　اور اِس بے بسی پر وہ حیران تھی

یکایک گئی آسماں پر نظر　　بندھی اُس کی اُمّید یہ دیکھ کر

کہیں دُور بادل کا ٹکڑا سا تھا　　تھا بادل کا ٹکڑا کہ سایہ سا تھا

یہ چاہا کہ اُڑ کر وہ پہنچے وہاں　　مگر واں پہنچنا تھا بس میں کہاں

بُرا حال اُس دُکھ کی ماری کا تھا　　وہ پھر بن گئی دُکھ بھری اِک دُعا

بچاری نے کی آسماں پر نظر　　پکاری، خدایا! مجھے شاد کر

خدا کو پسند آئی اُس کی ادا　　یکایک اُٹھی اِک طرف سے گھٹا

گھٹا دیکھتے دیکھتے چھا گئی　　بڑے زور کا مینہ برسا گئی

جدھر دیکھو، پانی ہی پانی ہُوا　　ہر اِک سمت، منظر تھا سیلاب کا

بجھی خوب تب، پیاسی چڑیا کی پیاس　　تھے خوش خوش سب ہی جان دار آس پاس

سبق پیاسی چڑیا سے ہم کو مِلا　　کہ ہوتی ہے منظور سب کی دُعا

نہیں ہے خدا اپنے بندوں سے دُور
دُعائیں وہ سُنتا ہے سب کی ضرور

حفیظ الرحمٰن احسن

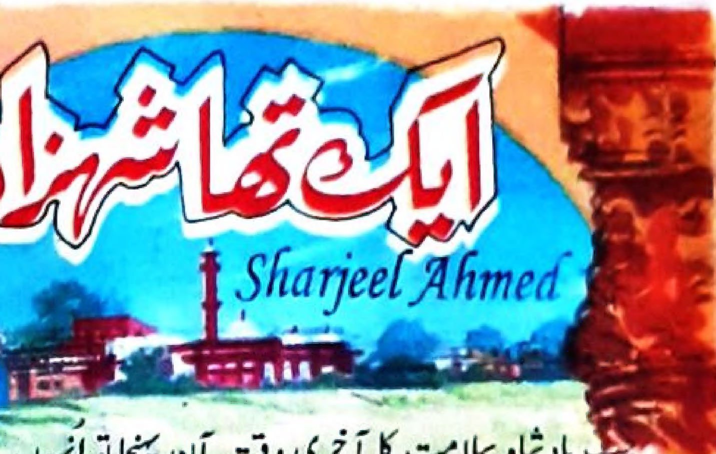

ایک تھا شہزادہ

سلیم احمد صدیقی

Sharjeel Ahmed

جب بادشاہ سلامت کا آخری وقت آن پہنچا تو انھوں نے اپنی بیٹی اور نواسے کو بُلانے کے لیے تیز رفتار گھڑسوار بھیجے۔ بادشاہ کا نواسا ابھی صرف پندرہ سولہ سال کا لڑکا ہی تھا اور دُور جنگل میں اپنی ماں کے ساتھ ایک جھونپڑی میں رہا کرتا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ جب وہ بادشاہ کا نواسا تھا تو محل کی بجائے جھونپڑی میں کیوں رہتا تھا؟ بات یہ ہے کہ بادشاہ نے اپنی بیٹی اور اُس کے شوہر کو کسی بات پر ناراض ہو کر محل سے نکال دیا تھا اور شہر میں ڈُگی پٹوا دی تھی کہ ملک کا کوئی آدمی اُن کی مدد نہ کرے۔ چُناں چہ شہزادی کے شوہر نے جنگل میں ایک کُٹیا بنالی اور وہ دونوں وہیں رہنے سہنے لگے۔ کچھ عرصے بعد شہزادی کے ہاں بیٹا پیدا ہُوا اور اُس کی پیدائش کے کچھ ہی دن بعد اُس کے باپ کو خوں خوار بھیڑیوں نے ہلاک کر دیا۔ شہزادی نے محنت مزدوری کر کے دو چار بکریاں خرید لی تھیں اور اب اُس کا بیٹا اپنی بکریوں کو جنگل میں چرایا کرتا تھا۔

جب بادشاہ کے سپاہی شہزادے کو محل میں لے کر آئے تو اُس کے ہاتھ میں گڈریوں والی لاٹھی تھی اور اُس نے گڈریوں جیسا لباس ہی پہنا ہوا تھا۔ جب اُس نے محل میں لوگوں کو خوب صورت اور رنگ برنگ لباس پہنے ہوئے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ محل میں تو ایک چیز بھی جھونپڑی جیسی نہ تھی۔ یہ بڑے بڑے قالین، لمبے لمبے پردے، دیواروں پر تصویریں، چاندی کے شمع دان، سونے کے برتن، ہر طرف، ہر جانب رنگ ہی رنگ، حسن ہی حسن۔ نوکروں نے اُسے گھیر لیا اور اُس کے ہاتھ سے گڈریوں والی لاٹھی لے لی۔ اِس کے بعد انھوں نے اُس کا لباس اُتروا کر اُسے عُمدہ سی پوشاک پہنا دی اور اُسے بتایا کہ کل وہ اِس ملک کا بادشاہ بنے گا۔

اُس دن وہ رات کو دیر تک جاگتا رہا اور جاگتے میں سُہانے سپنے دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کب اُسے نیند آ گئی۔

ابھی وہ سویا ہی تھا کہ اُس نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑے کمرے میں ہے جہاں بہت سارے مرد، عورتیں اور بچّے کسی کام میں مصروف ہیں۔ اُس نے غور سے دیکھا تو یُوں لگا جیسے وہ ایک بہت بڑا کارخانہ ہے اور وہ لوگ دراصل کھڈیوں پر کپڑا بُن رہے ہیں۔ وہ سب کے سب غریب ہیں اور پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ بچّے بچّیاں کھڈیوں کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں اور جب کھڈیوں کا کوئی دھاگا ٹوٹ جاتا ہے تو وہ اپنی ننھی ننھی نازک انگلیوں سے دھاگا جوڑ دیتے ہیں۔ یہ بچّے شکل و صورت سے کئی وقت کے بھُوکے دکھائی دے رہے تھے۔ سارا کمرا کھڈیوں کی کھٹاک پٹاک سے گونج رہا

تھا اور کسی کے بولنے چالنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ شہزادہ ایک جُولاہے کے پاس جاکر دیکھنے لگا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

"تم مجھے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہے ہو؟" اُس آدمی نے پوچھا "کیا ہمارے مالک نے تمہیں ہماری نگرانی پر مُقرّر کیا ہے؟"

"تمہارا مالک کون ہے؟" شہزادے نے پوچھا۔

"ہے تو وہ ہمارے ہی جیسا ایک آدمی، لیکن اُس کے پاس پہننے کے لیے اچّھے اچّھے کپڑے ہیں جب کہ ہمارے کپڑے پھٹے پُرانے ہیں۔ اُس کے پاس ضرورت سے کہیں زیادہ کھانے پینے کو موجود ہے جب کہ ہمارے بال بچّے کئی بار بھوکے ہی سو جاتے ہیں"۔

"اگر ایسا ہے تو تم اُس کے لیے کام کیوں کرتے ہو؟ مت کرو یہ کام" شہزادے نے کہا "تم کوئی غلام تھوڑا ہی ہو"۔

"غُلام تو نہیں" اُس آدمی نے جواب دیا "لیکن آزاد بھی نہیں ہیں۔ میرے پاس کرنے کے لیے اور کوئی کام بھی تو نہیں ہے۔ اگر میں یہ کام چھوڑ دوں تو بُھوکوں مرجاؤں گا۔ میرے بچّے بھی بھوکوں مرجائیں گے"۔

وہ آدمی باتیں بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کام بھی کیے جا رہا تھا۔ شہزادے نے دیکھا کہ جس دھاگے سے وہ شخص کپڑا بُن رہا تھا، وہ سونے کا تھا۔ اُس نے سوال کیا "یہ کپڑا کس کے لیے بُنا جارہا ہے؟"

"یہ ہمارے نئے بادشاہ کے لیے بُنا جا رہا ہے، جن کی تاج پوشی کل ہو رہی ہے" اُس شخص نے جواب دیا "ہمیں آج شام تک یہ کام ختم کرنا ہے"۔ شہزادے نے دیکھا کہ اُس شخص کی اُنگلیاں چِھل گئی ہیں اور وہ تکلیف میں ہے لیکن کپڑا بُنے چلا جا رہا ہے۔

"مت بنو یہ کپڑا! روک دو یہ کام!" شہزادہ چِلّایا۔ اُسی لمحے اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ اُس نے دیکھا کہ آسمان پر چاند چمک رہا ہے اور کھڑکی میں سے اُس کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ اُس نے کروٹ لی اور تھوڑی دیر میں پھر سو گیا۔ جلد ہی وہ ایک اور خواب دیکھنے لگا۔

اِس دفعہ اُس نے اپنے آپ کو ایک سمندری جہاز پر پایا، جسے حبشی غلام چلا رہے تھے اور اُن کے پاؤں ایک لمبی سی زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔ جہاز کے عرشے کے بیچوں بیچ ایک موٹا تازہ شخص ہاتھ میں ہنٹر لیے کھڑا تھا۔ اگر کوئی غلام ایک مِنٹ کو بھی چپّو چلانا روک دیتا تو یہ شخص اُس کی ننگی کمر پر زور سے ہنٹر مارتا، جس سے وہ درد سے بلبلا اُٹھتا اور پھر چپّو چلانے لگتا۔ جلد ہی وہ جہاز ایک چھوٹی سی خلیج میں پہنچ گیا۔ یہاں لنگر ڈال دیا گیا اور جہاز کے بادبان لپیٹ دیے گئے۔

اِس کے بعد اُن حبشی غلاموں میں سے ایک کی زنجیر کھول کر اُسے غوطہ لگانے کے لیے کہا گیا۔ وہ غلام تھوڑی دیر بعد ایک موتی ہاتھ میں لے کر پانی کے اُوپر آیا۔ موٹے تازے شخص نے (جو جہاز کا مالک تھا) وہ موتی اُس سے لے

لیا اور اُسے پھر سمندر میں غوطہ لگانے کے لیے کہا۔ غلام غوطہ خور کئی بار موتی لے کر آیا۔ اب وہ تھکن سے چُور ہو رہا تھا۔ اُس نے جہاز کے مالک سے کہا کہ وہ تھک گیا ہے۔ لیکن مالک نے اُسے ہنٹر دکھایا جس پر غلام پھر سمُندر میں کود گیا۔ اب کی بار وہ ایک بہت بڑا موتی لے کر آیا۔ مالک نے موتی اُس سے لے لیا اور کہنے لگا "یہ موتی شاہی عصا (لاٹھی) میں لگایا جائے گا"۔

اِس کے بعد اُس نے غلام کو پھر غوطہ لگانے کے لیے کہا۔ غلام نے غوطہ لگایا لیکن اِس بار وہ اُوپر نہ آیا۔ وہ ڈُوب گیا تھا۔ مالک نے اُس کی لاش کو سمُندر میں ہی چھوڑ دیا اور جہاز وہاں سے روانہ ہوگیا۔

شہزادہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا۔ چاند اب چُھپ چکا تھا لیکن ابھی رات کچھ باقی تھی۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ شہزادے نے کروٹ لی اور تھوڑی ہی دیر میں خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگا۔

اب کے اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک ویرانے میں چلا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک دریا کی خشک گزر گاہ تھی۔ لگتا تھا کہ اِس وادی میں کبھی دریا بہتا تھا لیکن اب وہاں پانی کا نام نشان تک نہ تھا۔ اِس جگہ زمین ریتلی تھی۔ شہزادے نے دیکھا کہ سینکڑوں آدمی ریت میں کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ سورج آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور سارے آدمی پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ لیکن پھر بھی ریت میں کچھ تلاش کیے جا رہے تھے۔

شہزادے نے دیکھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی آدمی نیچے گر پڑتا اور پھر نہ اُٹھتا۔ کئی آدمی اِس طرح گرے اور پھر نہ اُٹھے۔ شہزادے نے ایک آدمی کے پاس جا کر دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ وہ شخص مرگیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر گِدھ نمُودار ہوئے اور پہاڑی کے پیچھے سے خوف ناک قسم کے جانور آگئے۔

شہزادہ ڈر گیا۔ وہ زور سے چِلّایا "یہ کون لوگ ہیں اور کیا تلاش کر رہے ہیں؟" پیچھے سے اُسے ایک آواز آئی "یہ لوگ بادشاہ کے تاج کے لیئے یاقوت اور لعل تلاش کر رہے ہیں" یہ بات ایک ایسے آدمی نے کہی تھی جو ہاتھ میں ایک آئینہ لیے کھڑا تھا۔

"کس بادشاہ کے لیے؟" شہزادے نے پوچھا۔

اُس شخص نے آئینہ آگے کر دیا "اِس میں دیکھ لو۔ تمھیں وہ بادشاہ نظر آجائے گا"۔

شہزادے نے آئینہ دیکھا تو اُسے اُس میں اپنا ہی چہرہ نظر آیا۔ وہ چیخ مار کر جاگ گیا۔ اب صبح ہوگئی تھی اور سورج کی کرنیں کمرے میں آ رہی تھیں۔ جلد ہی کمرے میں کئی وزیر آگئے اور جُھک کر آداب بجالائے۔ پھر انُھوں نے غلاموں کو طلب کیا اور اُن سے کہا "بادشاہ سلامت کے لیے سونے کا لباس حاضر کیا جائے"۔

"بادشاہ سلامت کے لیے لعل اور یاقوت جَڑا تاج حاضر کیا جائے" دوسرا وزیر بولا۔

آناً فاناً غلاموں میں ہلچل مچ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں سونے کا لباس، لعل اور یاقوت جَڑا تاج اور سچّے موتیوں

سے سجا شاہی عصا لیے غلام حاضر ہو گئے۔

"تمام چیزیں حاضر ہیں۔ مُلاحظہ فرمالیں" ایک وزیر نے شہزادے سے کہا۔

شہزادے نے ایک نظر تینوں چیزوں پر ڈالی تو اُسے اپنے وہ تینوں خواب یاد آگئے جو اُس نے رات دیکھے تھے۔ اُس نے سرہلا کر کہا "اِن چیزوں کو یہاں سے لے جاؤ۔ میں اِنہیں اِستعمال نہیں کروں گا"۔ وزیر حیران رہ گئے اور آپس میں کُھسر پُھسر کرنے لگے۔ ایک وزیر ادب سے بولا "لیکن جہاں پناہ، بادشاہ کے لیے یہ چیزیں ضروری ہیں"۔

"نہیں، نہیں۔ اِنہیں یہاں سے لے جاؤ" شہزادے نے کہا "یہ سونے کے تاروں کا لباس دُکھوں کی کھڈی پر بُنا گیا ہے۔ سمُندر کی تہ سے موتی لانے والا غوطہ خور جان سے جا چکا ہے، اور لعل اور یاقوت کی تلاش میں کتنے ہی جوان اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں"۔

"یہ...... یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، حضُور؟" وزیروں نے پوچھا۔

"میں سچ کہ رہا ہوں" شہزادہ بولا اور وزیروں کو وہ تینوں خواب سُنائے جو اُس نے کل رات دیکھے تھے۔

ایک وزیر نے کہا "حضُور، اگر آپ یہ لباس نہیں پہنیں گے تو بادشاہ کیسے بنیں گے؟"

شہزادے نے مسکرا کر کہا "کیا بادشاہ صرف لباس، تاج اور شاہی عصا سے بادشاہ بنتا ہے؟ نہیں۔ میں بادشاہ بنوں گا تو اپنی خوبیوں کی وجہ سے بنوں گا نہ کہ اِن چیزوں کی وجہ سے"۔

"لیکن......" ایک وزیر نے کہا "لیکن یہ چیزیں تو تمام بادشاہ......"

"ہاں" شہزادے نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ چیزیں تمام بادشاہ اِستعمال کرتے ہیں، لیکن میں نہیں کروں گا--- میں سونے کے تاروں کے لباس کی بجائے اپنا گڈریے والا لباس پہنُوں گا"۔

"اور تاج کی بجائے؟"

"یہ رہا میرا تاج" شہزادے نے ایک طرف گملے میں سے گلاب کے پھولوں بھری ٹہنی توڑ کر سر پر باندھ لی۔

"اور شاہی عصا؟"

"یہ رہا میرا شاہی عصا" اُس نے اپنی گڈریے والی لاٹھی ہاتھ میں پکڑی اور اندر کمرے میں گڈریے والا لباس پہننے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ گڈریے والا لباس پہنے باہر آیا اور وزیروں سے پوچھا "تاج پوشی کی رسم ضروری ہے کیا؟"

"جی ہاں، اور یہ رسم درویش بابا شاہی مسجد میں ادا کرتے ہیں" ایک وزیر نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، تو میں چلا" شہزادے نے کہا "میرے ساتھ ایک غلام بھیج دو، راستہ بتانے کے لیے"۔

شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور غلام اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ لوگوں نے اُسے دیکھا تو ہنسنے لگے اور پوچھنے لگے "تم کون ہو؟ بھائی؟"

"میں تمہارا نیا بادشاہ ہوں" شہزادے نے جواب دیا۔

لوگوں کو یقین نہ آ رہا تھا۔ اِس پر شہزادے نے اُنہیں اپنے تینوں خواب سُنائے۔ تب لوگ کہنے لگے "اگر آپ سونے کے تار والا لباس نہیں پہنیں گے تو کاری گر بے کار ہو جائیں گے اور بھوکوں مرنے لگیں گے"۔

"نہیں، اُن کے روزگار کے لیے ہم کوئی اور بندوبست کر دیں گے" شہزادے نے کہا اور شاہی مسجد کی جانب چل پڑا۔ لوگ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے:

شاہی مسجد کے دروازے پر دو پہرے دار کھڑے تھے اُنھوں نے شہزادے کو روک دیا اور کہنے لگے "آج اِس دروازے سے ہمارے نئے بادشاہ سلامت اندر جائیں گے۔ اُن کے بعد رعایا کی باری آئے گی"۔

"میں ہی تمہارا نیا بادشاہ ہوں" شہزادے نے کہا۔

یہ سُن کر پہرے داروں نے شہزادے کو تعجبؒ سے

سے سجا شاہی عصا لیے غلام حاضر ہو گئے۔

"تمام چیزیں حاضر ہیں۔ مُلاحظہ فرمالیں" ایک وزیر نے شہزادے سے کہا۔

شہزادے نے ایک نظر تینوں چیزوں پر ڈالی تو اُسے اپنے وہ تینوں خواب یاد آ گئے جو اُس نے رات دیکھے تھے۔ اُس نے سرہلا کر کہا "اِن چیزوں کو یہاں سے لے جاؤ۔ میں اِنہیں اِستعمال نہیں کروں گا"۔ وزیر حیران رہ گئے اور آپس میں کُھسر پُھسر کرنے لگے۔ ایک وزیر ادب سے بولا "لیکن جہاں پناہ، بادشاہ کے لیے یہ چیزیں ضروری ہیں"۔

"نہیں، نہیں۔ اِنہیں یہاں سے لے جاؤ" شہزادے نے کہا "یہ سونے کے تاروں کا لباس دُکھوں کی کھڈّی پر بُنا گیا ہے۔ سمُندر کی تہ سے موتی لانے والا غوطہ خور جان سے جا چکا ہے، اور لعل اور یاقوت کی تلاش میں کتنے ہی جوان اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں"۔

"یہ...... یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، حضُور؟" وزیروں نے پوچھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں" شہزادہ بولا اور وزیروں کو وہ تینوں خواب سُنائے جو اُس نے کل رات دیکھے تھے۔

ایک وزیر نے کہا "حضُور، اگر آپ یہ لباس نہیں پہنیں گے تو بادشاہ کیسے بنیں گے؟"

شہزادے نے مسکرا کر کہا "کیا بادشاہ صرف لباس، تاج اور شاہی عصا سے بادشاہ بنتا ہے؟ نہیں۔ میں بادشاہ بنوں گا تو اپنی خوبیوں کی وجہ سے بنوں گا نہ کہ اِن چیزوں کی وجہ سے"۔

"لیکن......" ایک وزیر نے کہا "لیکن یہ چیزیں تو تمام بادشاہ......"

"ہاں" شہزادے نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ چیزیں تمام بادشاہ اِستعمال کرتے ہیں، لیکن میں نہیں کروں گا--- میں سونے کے تاروں کے لباس کی بجائے اپنا گڈریے والا لباس پہنُوں گا"۔

"اور تاج کی بجائے؟"

"یہ رہا میرا تاج" شہزادے نے ایک طرف گملے میں سے گُلاب کے پھولوں بھری ٹہنی توڑ کر سر پر باندھ لی۔

"اور شاہی عصا؟"

"یہ رہا میرا شاہی عصا" اُس نے اپنی گڈریے والی لاٹھی ہاتھ میں پکڑی اور اندر کمرے میں گڈریے والا لباس پہننے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ گڈریے والا لباس پہنے باہر آیا اور وزیروں سے پوچھا "تاج پوشی کی رسم ضروری ہے کیا؟"

"جی ہاں، اور یہ رسم درویش بابا شاہی مسجد میں ادا کرتے ہیں" ایک وزیر نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، تو میں چلا" شہزادے نے کہا "میرے ساتھ ایک غلام بھیج دو، راستہ بتانے کے لیے"۔

شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور غلام اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ لوگوں نے اُسے دیکھا تو ہنسنے لگے اور پوچھنے لگے "تم کون ہو بھائی؟"

"میں تمہارا نیا بادشاہ ہوں" شہزادے نے جواب دیا۔

لوگوں کو یقین نہ آ رہا تھا۔ اِس پر شہزادے نے اُنہیں اپنے تینوں خواب سُنائے۔ تب لوگ کہنے لگے "اگر آپ سونے کے تار والا لباس نہیں پہنیں گے تو کاری گر بے کار ہو جائیں گے اور بھوکوں مرنے لگیں گے"۔

"نہیں، اُن کے روزگار کے لیے ہم کوئی اور بندوبست کر دیں گے" شہزادے نے کہا اور شاہی مسجد کی جانب چل پڑا۔ لوگ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے:

شاہی مسجد کے دروازے پر دو پہرے دار کھڑے تھے اُنھوں نے شہزادے کو روک دیا اور کہنے لگے "آج اِس دروازے سے ہمارے نئے بادشاہ سلامت اندر جائیں گے۔ اُن کے بعد رِعایا کی باری آئے گی"۔

"میں ہی تمہارا نیا بادشاہ ہوں" شہزادے نے کہا۔

یہ سُن کر پہرے داروں نے شہزادے کو تعجّب سے

دیکھا اور پھر اُسے اندر جانے دیا۔ درویش بابا اُس کا اِنتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا "آپ یہ کس قسم کا لباس پہن کر آئے ہیں، شہزادے؟ شاہی لباس زیب تن کرلیں تو میں آپ کی تاج پوشی کروں"۔

"شاہی لباس؟ درویش بابا، آپ مسجد میں کھڑے ہیں۔ یہ اللہ کا گھر ہے۔ یہاں تو آپ کو اِس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب اِنسانوں کو برابر پیدا کیا ہے" یہ کہہ کر شہزادے نے اپنے خواب درویش بابا کو سُنائے۔

"میرے اچھے برخوردار" درویش بابا بولے "میں ایک بوڑھا آدمی ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ دُنیا میں بہت سے کام اچھے نہیں ہوتے۔ لیکن آپ اُنہیں روک نہیں سکتے۔ لہٰذا آپ واپس محل میں تشریف لے جائیں اور شاہی لباس پہن کر تشریف لائیں۔ آپ کے ہاتھ میں شاہی عصا ہو اور غلام تاج لیے آپ کے ساتھ ہو جسے میں بِسمِ اللہ پڑھ کر آپ کے سر پر رکھوں گا"۔

شہزادے نے درویش بابا کا کہا نہ مانا اور منبر پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے منبر پر کھڑے ہونے کی دیر تھی کہ سارا منظر ہی بدل گیا۔ تمام لوگ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ سورج کی کرنیں مسجد کے روشن دان کے رنگین شیشوں سے چھَن چھَن کر شہزادے کے سادہ لباس پر پڑ رہی تھیں، جس سے وہ لباس سونے کا بن گیا تھا۔ شہزادے نے ہاتھ میں جو لاٹھی پکڑی ہوئی تھی، اُس کے سِرے پر سوسن کے خوب صورت پھول اُگ آئے تھے، اور اُس نے سر پر گلاب کی پھولوں بھری جو شاخ باندھ رکھی تھی، اُس کے گلابوں کا رنگ بہت شوخ ہو گیا تھا اور اُن کی خوش بو تمام مسجد میں پھیل گئی تھی۔

سب لوگ خوشی سے چِلّا رہے تھے "تاج پوشی مُبارک ہو!"

درویش بابا آگے بڑھ کر بولے "بادشاہ سلامت! قُدرت نے خود آپ کی تاج پوشی کر دی ہے۔ اب مجھے آپ کو تاج پہنانے کی ضرورت نہیں"۔

سارے شہر میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ شہزادہ اپنے گڈریے والے رُوپ ہی میں بادشاہ بن گیا تھا۔

(آسکر وائلڈ کی کہانی سے ماخوذ)

واہ وا سبحان اللہ

ذکیہ بلگرامی

(گرمیوں کی چھٹیاں ہیں۔ رشتے کے سب بھائی بہن آج ایک ہی گھر میں جمع ہیں۔ فوزیہ اور عافیہ اِسلام آباد سے کراچی آئی ہوئی ہیں۔ اِنہی کی فرمائش پر ایک محفلِ مُشاعرہ مُنعقد کی جا رہی ہے جس میں یہ سب بھائی بہن حصّہ لے رہے ہیں۔ مُشاعرے کے صدر خالد بھائی ہیں۔ بچّے بڑے سب خاموشی سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے ہیں۔ مُشاعرہ شروع ہوتا ہے)

خالد بھائی: بِسم اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیم۔ اب ہم اپنے خاندانی مُشاعرے کا آغاز کرتے ہیں اور سب سے پہلے محترمہ عالیہ رحمان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تشریف لائیں اور اپنا کلام پیش کریں۔

عالیہ: خالد بھائی، آپ نے تو کوئی شعر سُنایا نہیں۔ اچانک مجھے پکار لیا۔

خالد بھائی: جو کہا جائے، وہی کرو۔

(عالیہ، اِسٹیج پر آتی ہے جو ڈرائنگ روم کے ایک طرف بنایا گیا ہے)

عالیہ (گلا صاف کر کے): میری نظم کا عُنوان ہے، "اِسکول کا بچّہ"۔

فوزیہ: اب تم اِسکول سے نکل چکی ہو۔ کالج کی لڑکی پر کوئی نظم لکھنی تھی۔

خالد بھائی: آپ سب لوگ براہِ مہربانی خاموش رہیں۔

(سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ عالیہ نظم سُناتی ہے)

چھوٹا سا ایک بچّہ، اِسکول جا رہا ہے
تیّار ہو رہا ہے اور غُل مچا رہا ہے
بستہ کہیں دھرا ہے، کاپی کہیں پڑی ہے
چھوٹی سی خاکی نیکر، مُشکل سے ہی چڑھی ہے
جُوتے پہ اُس کے پالش، نوکر لگا رہا ہے
چھوٹا سا ایک بچّہ اِسکول جا رہا ہے
پنسل ہے نہ ربر ہے، اُس کو نہ کچھ خبر ہے
ٹیچر کی ڈانٹ کا بھی، کچھ خوف، کچھ نہ ڈر ہے
باتیں بنا رہا ہے، اِک گیت گا رہا ہے
چھوٹا سا ایک بچّہ، اِسکول جا رہا ہے
ابّو نے دیں دُعائیں، امّی نے لیں بلائیں
تاکید کر رہی ہیں کہ لنچ ضرور کھائیں
اِسکول بس ڈرائیور، ہارن بجا رہا ہے
چھوٹا سا ایک بچّہ اِسکول جا رہا ہے

(عالیہ اپنی نظم سُنا کر جلدی سے واپس آ جاتی ہے۔

سب لوگ تالیاں بجاتے ہیں- خوب واہ وا ہوتی ہے)

خالد بھائی: یہ تھیں عالیہ رحمان- اب میں محترمہ کرن صاحبہ کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنا کلام پیش کریں-

"کرن: عرض کیا ہے......

عافیہ (زور سے): اِرشاد! اِرشاد!

(گھر کا ملازم اِرشاد دوڑا ہوا آتا ہے)

اِرشاد: جی، بی بی جی؟

خالد بھائی: تم بھاگو یہاں سے- تمھیں نہیں بلایا ہے-

(سب لوگ ہنستے ہیں)

کرن: ہاں تو، عرض کیا ہے:

کاشف (زور سے): اِرشاد! اِرشاد!

(اِرشاد دروازے تک آتا ہے مگر خالد بھائی کی شکل دیکھ کر خاموشی سے لوٹ جاتا ہے)

کرن: یہ نظم میں نے اپنے چھوٹے بھائی عارف کے اوپر لکھی ہے- ذرا خاموشی سے سنیے گا:

جاسوسی ناولوں کا چسکا لگا ہے اِس کو
ہے اِمتحان سر پر، کچھ ڈر نہیں ہے اِس کو
امّی سے ڈانٹ کھائی، ابّو نے کی پٹائی
نانا نے کی نصیحت، نانی نے کی ٹھکائی
آخر کو ہوش آیا، عارف کو جوش آیا
رٹّے لگائے اُس نے اور خوب کی پڑھائی
نمبر جو اِمتحاں میں، اچھے لیے ہیں اِس نے
امّی سے مانگتا ہے، اب دو کلو مٹھائی
امّی بھی اب تو خوش ہیں، ابّو بھی مطمئن ہیں
ہے سال بھر کی محنت، کیا خوب رنگ لائی
حیرت یہ ہو رہی ہے، کیا ہوگیا ہے اِس کو؟
اب پھر وہی ڈھٹائی، اور پھر وہی پٹائی

(سب تالیاں بجاتے ہیں- واہ وا کرتے ہیں- عارف منہ بنا رہا ہے)

خالد بھائی: اچھا، اب عارف میاں، آپ تشریف لائیں-

(عارف چھلانگ لگا کر تیزی سے اِسٹیج پر پہنچتا ہے اور نظم کا پرچہ کھولتا ہے)

عارف: میری نظم کا عنوان ہے، میری باجی-

کرن: اچھا تو تم بدلہ لے رہے ہو، مجھ سے؟ گھر جا کر خبر لوں گی تمھاری-

خالد بھائی: کرن، آپ خاموش رہیں- عارف آپ شروع کریں-

عارف: عرض کیا ہے.......

عافیہ: اِرشاد! اِرشاد!

(اِرشاد ایک بار پھر بھاگا ہوا آتا ہے اور حیرت سے کہتا ہے) کیا ہوگیا، صاحب جی؟

خالد بھائی: اُفوہ! تم کیوں آ جاتے ہو بار بار- بھاگو یہاں سے- ہم تمھیں نہیں بلا رہے ہیں- یہاں مشاعرہ ہو رہا ہے-

(ارشاد حیران ہو کر سب کو دیکھتا ہے، پھر واپس چلا جاتا ہے)۔

عارف : عرض کیا ہے

ٹیچر بنی ہے باجی، بچّے پڑھا رہی ہے
ٹیوشن پڑھا پڑھا کر، دولت کما رہی ہے
اب بانٹتی ہے سب کو، کیوں قیمتی تحائف
شاید دلوں میں سب کے، اُلفت جگا رہی ہے
سب کی ہے فکر اِس کو، میری نہیں ہے پروا
بھیّا ہُوں اِس کا پھر بھی، دُرگت بنا رہی ہے
اِک بات میں کہوں گا، گر تو بُرا نہ مانے
سِکّے دکھا کے باجی، سِکّہ جما رہی ہے

"سُبحان اللہ! واہ وا!" کی آوازیں گونجتی ہیں۔ سب تالیاں بجاتے ہیں، خوش ہوتے ہیں)

خالد بھائی : اب میں کاشِف صاحِب کو زحمت دُوں گا۔ کاشِف صاحِب، آپ اپنا کلام سُنائیں۔

(کاشِف اکڑتا ہوا ڈائس پر آتا ہے اور اچانک کلام سُنانا شروع کر دیتا ہے):

کاپی کتاب بھی ہے، پنسل ہے، شاپنر ہے
فائل دھری ہے اِس میں، فُٹّا بھی ہے، ربر ہے
دُکھڑا سُناؤں کِس کو، ہر شخص بے خبر ہے
بستہ اُٹھا اُٹھا کر، خم ہوگئی کمر ہے
مُشکِل میں پڑ گیا ہُوں، آخر کہُوں میں کِس سے؟
بستہ بہُت ہے بھاری، اُٹھتا نہیں ہے مُجھ سے
اب صبر کر رہا ہوں اور گیت گا رہا ہوں
کاشِف میں گیت گا کر، غم کو بُھلا رہا ہوں

عافیہ : ہائے! افسوس! صد افسوس! آپ پر مشکل تو واقعی پڑی ہے مگر براہِ کرم گیت نہ گایئے گا۔ آپ کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ دے گی۔

(سب ہنستے ہیں)

خالد بھائی : عافیہ، آپ خاموش رہیں۔ جو کچھ کہنا ہے مشاعرے کے بعد کہیۓ گا۔ ویسے اب میرے پاس آپ ہی کا نام رہ گیا ہے۔ تشریف لائیں اور اپنی اُوٹ پٹانگ شاعری سے سب کو محظُوظ کریں۔

عافیہ : خالد بھائی، آپ صدرِ مُشاعرہ ہیں۔ آپ کو غیر جانب دار ہونا چاہیۓ۔ آپ میری شاعری کی توہین کر رہے ہیں۔

خالد بھائی : (مسکراتے ہوئے) : سوری، بھئی۔ آپ تشریف لائیں اور اپنا خوب صورت کلام سُنائیں۔

عافیہ :

کراچی کی گرمی ستم، توبہ! توبہ!
کہاں پھنس گئے آکے ہم، توبہ! توبہ!
کِدھر پائیں ہم مُشک و عنبر کی خوش بُو
کہ پھیلی ہے ہر سُو پسینے کی بدبُو
نہ پانی، نہ بجلی، نہ پنکھا، نہ اے سی
کراچی کا موسم، تری ایسی تیسی

عارف : آپ اِسلام آباد سے آئی ہیں نا۔ تب ہی بڑھ بڑھ کر بول رہی ہیں۔

عافیہ : تم چُپ رہو- خبردار! جو مجھے کچھ کہا-

فوزیہ (عافیہ کی بڑی بہن) : عافیہ، تم تو بات بے بات لڑنے بیٹھ جاتی ہو- عارف تم سے چھوٹا ہے- اِس کا خیال کرو-

عافیہ : آپ کیوں بول رہی ہیں بیچ میں؟ میری مرضی- کسی سے کچھ بھی کہوں-

خالد بھائی : اچھا بھئی، اب لڑائی بند کریں- یہ ننّھا بچّہ، عارِج، بھی کچھ سُنانے آ رہا ہے-

(سب خاموش ہو جاتے ہیں- کلاس ون کا بچّہ عارِج آتا ہے- اُس کے ہاتھ میں ایک پرچہ ہے- دوسرے چھوٹے بچّے عماد، دانیال اور سباتا بھی اُس کے ساتھ ہی اُوپر آ جاتے ہیں)

خالد بھائی : ہاں بھئی، عارِج، سُناؤ بیٹا جلدی سے-

عارِج (شرارت بھری آنکھوں سے سب کو دیکھتا ہے- پھر کہتا ہے) :

میں فوجی بنوں گا، لڑائی کروں گا
میں عموُّ کی اِک دِن پٹائی کروں گا

(عماد کو اپنا نام سُن کر غُصّہ آجاتا ہے- وہ عارج کی پٹائی شروع کر دیتا ہے- جواب میں عارج عماد کو مارتا ہے- عماد حلق پھاڑ کر رونا شروع کر دیتا ہے- بھائی کو روتا دیکھ کر سباتا بھی رونے لگتی ہے- شور مچ جاتا ہے- دھکم پیل میں دانیال گر جاتا ہے- وہ بھی رونے لگتا ہے-

عماد کی امّی اور دانیال کی امّی اپنے اپنے بچّوں کو سنبھالنے کے لیے لپکتی ہیں- خالد بھائی زور زور سے نوکر کو آواز دیتے ہیں "اِرشاد! اِرشاد!" مگر نوکر اب نہیں آتا- وہ سمجھ رہا ہے کہ یہاں مُشاعرہ ہو رہا ہے- ڈرائنگ روم میں طرح طرح کی آوازیں گونج رہی ہیں- مُشاعرہ درہم برہم ہو جاتا ہے)

بینک کی جس شاخ میں میں کام کر رہا تھا' اُس کے مینجر صاحِب ریٹائر ہو رہے تھے اور اُن کی جگہ نئے مینجر صاحب آ رہے تھے' اور ان کے بارے میں بہُت باتیں ہو رہی تھیں :

"مُبارک ہو' بھئی۔ سُنا ہے صِدیقی صاحِب آ رہے ہیں۔ اب ذرا سنبھل کر کام کرنا۔ وہ چھوٹی سی غلَطی بھی مُعاف نہیں کرتے۔ تمہارے سر پر تو پہلے ہی بال نہیں ہیں"۔

"میری فِکر نہ کرو' میاں۔ اپنا حساب کتاب ٹھیک رکھنا۔ سُنا ہے یہ صاحِب کئی لوگوں کو جیل بھجوا چکے ہیں"۔

"میں نے تو سُنا ہے کئی ایک کی تو نوکری ہی ختم کرا دی اِن مومِن مُسلمان صاحِب نے۔ چلتے ہوئے قدم تک گِنتے ہیں اپنے"۔

"اور کبھی کوئی قدم کم یا زیادہ ہو جائے تو خود اپنے اُوپر جرُمانہ کر دیتے ہیں"۔

یہ باتیں صِدّیقی صاحِب کے آنے سے ایک دن پہلے ہُوئی تھیں اور سیٹھی کی بات پر زبردست قہقہہ پڑا تھا جس میں میری آواز بھی شامل تھی۔ ویسے سچّی بات یہ تھی کہ نئے مینجر صاحِب کے آنے کی وجہ سے میرے ساتھیوں کے دِلوں میں جو دُھکڑ پکڑ ہو رہی تھی' اُس سے میرا دل بھی خالی نہ تھا۔ ہمارے پُرانے مینجر صاحِب کا حال تو یہ تھا کہ بینک کے سب مُلازِم اُنہیں اپنا بُزرگ سمجھتے تھے۔ کسی سے غلَطی ہو جاتی تو ناراض ہونے کی جگہ اُسے تسلّی دیتے "کوئی بات نہیں' بیٹا۔ ایک بار اپنا حساب اور چیک کرو۔ اُمّید ہے ٹوٹل مِل جائے گا"۔ اور اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ کبھی کسی سے واقعی غلطی ہو جاتی تو اُسے اِس طرح ٹھیک کرا دیتے کہ غلَطی کرنے والے کو ذرا سا نُقصان بھی نہ پہنچتا۔ ایک بار تو اُنہوں نے کمال ہی کر دیا۔ مِرزا صاحِب نے ایک ایسے چیک کی رقم دے دی جس پر جعلی دست خط تھے اور مینجر صاحِب نے یہ رقم اپنی جیب سے ادا کر کے مرزا کو بچالیا۔

اب ہمارے یہ بہُت ہی پیارے سے مینجر صاحِب جا رہے تھے اور اُن کی جگہ ایک ایسا آدمی آ رہا تھا جو بالکُل مرکھنا بیل لگ رہا تھا۔ اور جب یہ نئے مینجر صاحِب پہلے دن آئے تو اُن کی صورت دیکھتے ہی مجھے وہ ساری باتیں بالکُل سچ لگیں جو اُن کے بارے میں کہی جا رہی تھیں۔ میں نے بہُت عاجِزی کے ساتھ دُعا مانگی "یا اللہ ! مجھے اور اپنی ساری مخلوق کو اِس آدمی سے محفوظ رکھنا!"

دُعا مانگ کر میں نے چور نظروں سے مینجر صاحِب کی طرف دیکھا اور اپنے آپ کو یقین دِلانے کی کوشش کی کہ یہ وہ نہیں ہے۔ مجھے دھوکا لگا ہے۔ لیکن وہ تو بالکُل وہی تھا۔ ماتھے پر زخم کا نشان' ایک اور نشان ناک کے پاس اور نیچے

کا ہونٹ تھوڑا سا کٹا ہُوا۔

نئے مینجر صاحب کو دوبارہ غور سے دیکھ کر میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ صاحب چیمپیئن ہی ہیں۔

میں اور چیمپیئن ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے، اور وہ نہ صرف ہماری جماعت بلکہ پورے اِسکول میں شیطان کی طرح مشہور تھا۔ بات بات پر لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا اور نِت نئی شرارتیں کرتا۔ مجھ سے تو اُسے گویا خدا واسطے کا بیر تھا۔ چُپکے سے کسی کی کتاب، کاپی یا پنسل میرے بیگ میں رکھ دیتا اور پھر اُس لڑکے سے کہتا کہ علیم نے تمہاری چیز چُرا کر اپنے بستے میں رکھ لی ہے۔ تلاشی لی جاتی تو وہ چیز میرے بیگ میں مل جاتی اور میں شرمندہ ہوتا۔ ایک بار تو ہیڈ ماسٹر صاحب تک بات پہنچی اور مجھے سزا ملی، بالکُل بے گُناہ۔ اُس دن میں نے اِن چیمپیئن صاحب کو بُہت بد دُعائیں دی تھیں۔ اللہ میاں سے کہا تھا کہ ساری زندگی اِن کی پٹائی ہوتی رہے۔ اِنھیں روزانہ مُرغا بنایا جائے اور بنچ پر کھڑا کیا جائے۔

شرارتی اور لڑاکا ہونے کے ساتھ ساتھ یہ صاحب پڑھائی میں بھی بالکُل نِکمّے تھے۔ ماسٹر صاحب کتاب میں سے کوئی بات پوچھتے تو سر جُھکا کر آنکھیں بند کر لیتے۔ ماسٹر صاحب مجبور ہو کر اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیتے اور دوسرے طالب علموں کی طرف مُتوَجّہ ہو جاتے۔

مجھے یہ ساری باتیں یاد آگئی تھیں اور اِس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ ایسے نالائق اور نِکمّے شخص کو اِتنا بڑا عُہدہ کیسے مِل گیا؟ اِسے تو معمولی سا مزدُور یا خوانچہ فروش ہونا چاہیئے تھا۔ اِتنے میں نائب قاصِد میرے پاس آیا اور نئے مینجر صاحب کی طرف اِشارہ کر کے کہا "آپ کو مینجر صاحب بُلا رہے ہیں"۔

میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا اپنے پُرانے ساتھی اور اِس وقت کے مینجر صاحب کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ادب سے میرا سر جُھکا ہوا تھا اور دل اِس خوف سے دھڑک رہا تھا کہ کہیں اِن چیمپیئن صاحب نے بھی مجھے پہچان تو نہیں لیا۔

وہ صاحِب افسروں کی شان سے سر جُھکائے اپنا کام کرتے رہے۔ میری طرف دیکھا تک نہیں۔ کچھ وقت اِسی طرح گزر گیا۔ پھر اُنھوں نے سر جُھکائے جُھکائے ایک چِٹ میری طرف بڑھا دی۔ اُس پر لکھا تھا "کتابی کیڑا"۔ اِسکول میں وہ مجھے اِسی نام سے پُکارتے تھے۔

میں نے چِٹ پڑھ کر اُن کی میز پر سے قلم اُٹھایا اور دوسری طرف لکھ دیا "چیمپیئن"۔ اُنھوں نے چِٹ پڑھ کر میری طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں ہنس پڑے۔

میں اُن کے کہے بغیر اُن کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا "چیمپیئن صاحِب، میں نے تو آپ کے چہرے کی نشانیوں سے آپ کو پہچان لیا تھا، لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟"

"میرے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی میں کھُجلی ہونے لگی تھی، جس سے تمہاری مرمّت کیا کرتا تھا۔ سمجھے، کتابی کیڑے صاحِب؟" اُن کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ ادھر میرا بھی یہی حال تھا۔ کوئی بیس برس بعد اپنا وہ نام سُن کر جسے سُن کر مجھے غصّہ آیا کرتا تھا، میرا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ میں نے کہا "یہ تو خدا کی خاص مہربانی ہوئی ہے ہم دونوں پر۔ اِتنے برسوں بعد ملے ہیں اور وہ بھی بہُت اچھّے حالات میں"۔

"اچھا، اب باتوں کا یہ سِلسلہ ختم۔ اپنی جگہ جاؤ اور یہاں آنے میں جو وقت لگا ہے، اُس کی کسر نکالو۔ میں وقت برباد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ بینک بند ہونے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔ باقی باتیں ہوٹل میں ہوں گی۔ میں عام طور پر چھُٹّی ہونے کے بعد بھی کچھ دیر بیٹھا کرتا ہوں۔ لیکن آج ٹھیک وقت پر اُٹھ جاؤں گا اور تم بھی اُس وقت تک گھر نہیں جاؤ گے جب تک میں اِجازت نہ دوں گا۔ سمجھے، کتابی کیڑے صاحِب؟" اُنھوں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

اِس کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم دونوں ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ گزُرے زمانے کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی اور یُوں لگ رہا تھا کہ ہم اُسی زمانے میں پہنچ گئے ہیں اور بے فِکرے طالبِ علم بن گئے ہیں۔ یہ باتیں کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بچپن اور لڑک پن کا زمانہ کتنا قیمتی اور کیسا خوب صورت ہوتا ہے۔ کاش! بچّوں کو یہ بات معلوم ہو جائے۔

ہم اُس قیمتی زمانے اور پیاری عُمر کی ایک ایک بات دُہرا چکے تو میں نے کہا "سر، اور باتیں تو ہوتی رہیں گی، یہ بتائیے، وہ نِکمّا، نٹ کھٹ چیمپئن ایسا شان دار عُہدہ حاصِل کرنے میں کیسے کامیاب ہوگیا؟ میرا اندازہ تو یہ تھا کہ یہ صاحِب جو چیمپئن کہلا کر بہُت خوش ہوتے ہیں اور مار دھاڑ کر کے مار کُٹائی کے چیمپئن بننے کی کوشش کرتے ہیں، سر پر بڑا سا ٹوکرا اُٹھا کر سبزی ترکاری بیچا کریں گے یا اِسٹیشن پر قلی کا کام کیا کریں گے"۔

میری یہ بات سُن کر صِدّیقی صاحِب زور سے ہنسے "تم تو کیا، میری امّی جان بھی یہی کہا کرتی تھیں اور میری حالت بھی ایسی ہی تھی کہ میں یہی کچھ کر سکتا تھا۔ آدمی کو عِزّت اور عُہدہ تو عِلم سے مِلتا ہے اور میرا حال یہ تھا کہ پڑھنے لکھنے میں دل ہی نہ لگتا تھا۔ لیکن خدا کی شان نرالی ہے۔ پھر ایسا ہُوا کہ مجھے تعلیم حاصل کرنے سے اچھّی کوئی اور بات لگتی ہی نہ تھی، اور یہ سب کچھ میرے ایک مُحترم اُستاد صاحِب کی مہربانی سے ہُوا۔ تم تو پانچویں پاس کر کے مُلتان چلے گئے تھے۔ تمہارے ابّاجان کا تبادلہ ہوگیا تھا۔ لیکن میں نہ صرف لاہور میں رہا بلکہ دو برس اور پانچویں کلاس ہی میں رہا"۔

"یعنی فیل ہوتے رہے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا۔ مُجھ جیسے لڑکے پاس ہُوا کرتے ہیں؟ میرا تو خیال ہے شاید دو چار سال اور یہی سِلسلہ چلتا، لیکن اللہ پاک نے اپنی خاص رحمت سے میری بھلائی کا سامان کر دیا۔ جو ماسٹر صاحب ہمیں اُردو پڑھاتے تھے، وہ ترقّی پا کر کسی اور جگہ چلے گئے اور اُن کی جگہ ایک نئے ماسٹر صاحِب آئے۔ وہ شکل و صورت اور لباس سے بالکُل مولوی صاحِب لگتے تھے۔ اُنہیں دیکھا تو مجھے خوشی ہوئی کہ کم سے کم اِن کی طرف سے کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچے گی اور اگر ایسی صورت پیدا ہوئی تو اِنہیں آسانی سے دھوکا دیا جا سکے گا۔ لیکن پہلے دن ہی میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ یہ مولوی صاحِب تو پہلے ماسٹر صاحِب کے مقابلے میں کوئی 500 گُنا زیادہ سخت نکلے"۔

"اِکٹھے پانچ سو گُنا زیادہ؟" میں نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

"پانچ سو گُنا نہیں، چھ سو گُنا زیادہ۔ اُنھوں نے پوری کلاس کی کاپیاں خوب غور سے دیکھیں اور پھر رُعب بھری آواز میں بولے "بچّو! یہ جان کر ہمیں بہُت دُکھ ہُوا ہے کہ اپنی قومی زبان اُردو میں تم بہُت کم زور ہو، جب کہ اِس میں تو بہُت اچھّا ہونا چاہیے، کیوں کہ یہی زبان تمہاری ترقّی

کا سبب بنے گی۔ خیر، جو کچھ پہلے ہُوا، ہو چکا۔ لیکن اب یہ بے پروائی اور نکمّا پن نہیں چلے گا۔ جو بچّہ محنت نہیں کرے گا اور پہلے کی طرح بے پروا رہے گا، اُس کے ساتھ ہم جو سلوک کریں گے وہ کچھ اچھّا نہ ہو گا"۔

یہ کہ کر مولوی صاحِب نے میری طرف دیکھا اور کھڑے ہونے کا اِشارہ کرتے ہوئے بولے "برخوردار، تمھاری حالت تو ماشاء اللہ سب سے گئی گُزری ہے۔ نالائق میں چیمپئن لگتے ہو" اور جیسے ہی اُن کی زبان سے یہ لفظ نکلا، ایک ساتھ کئی آوازیں آئیں "سر، یہ تو ہے ہی چیمپئن"۔

"ماشاء اللہ ! ماشاء اللہ !" مولوی صاحِب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھے اپنے پاس بُلا کر کمر پر تھپکی دیتے ہوئے بولے "بڑی خوشی ہوئی یہ سُن کر کہ تم واقعی چیمپئن ہو۔ لیکن برخوردار، نالائقی میں چیمپئن بننا تو کچھ عزّت کی بات نہیں۔ چیمپئن بننا بہُت اچھی بات ہے، لیکن کسی اچھے کام میں"۔

یہاں تک کہ کر صِدّیقی صاحِب کچھ دیر کے لیے رُکے اور پھر سانس لے کر بولے "میری زندگی میں وہ پہلا دن تھا جب مجھے اپنی حالت پر افسوس ہُوا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مولوی صاحِب نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب کیا اور پیار بھری آواز میں بولے "بیٹے، رنج نہ کرو۔ ہاں، اپنی عادتیں بدلنے کی کوشش ضرور کرو۔ اللہ پاک نے اپنی خاص رحمت سے اِنسان کو بہُت سی طاقتیں دی ہیں۔ اُس نے اپنی سب مخلوق میں اِنسان کو سب سے زیادہ عزّت دی ہے۔ اِسے سب کا سردار بنایا ہے۔ اِس کا رُتبہ فرشتوں سے بھی زیادہ ہے۔ اگر تم اللہ کی دی ہوئی طاقتوں سے کام لو گے تو سچ مچ چیمپئن بن جاؤ گے۔ لگتا ہے کھیل کُود میں زیادہ لگے رہتے ہو۔ اب ایسا کرو کہ اپنی پڑھائی کی طرف زیادہ دھیان دو۔ ہم تمھاری پوری پوری مدد کریں گے"۔

"جی، میں کوشش تو کرتا ہوں لیکن کوئی بات یاد ہی نہیں ہوتی" میں نے کہا۔

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ ہمارا بیٹا نالائق نہیں ہے، بلکہ مُعاملہ کچھ اور ہے۔ اچھّا میاں، اگر ہم تمھیں ایسی ترکیب بتا

دیں کہ جو پڑھو فوراً یاد ہو جائے تو پھر تو خوب شوق اور محنت سے پڑھا کرو گے؟"

"جی، ضرور" میں نے جوش بھری آواز میں کہا۔

مولوی صاحب بولے "اچھا تو یہ بات ہم تمہیں آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد بتائیں گے۔ بس شرط یہ ہے کہ تم خود پوچھنا۔ ہم خود نہیں بتائیں گے۔ اِن شاء اللہ پھر تمہیں ہر بات آسانی سے یاد ہو جایا کرے گی"۔

"جی، میں خود پوچھوں گا" میں نے وعدہ کیا اور دل میں پکّا اِرادہ کرلیا کہ ایسی فائدہ مند ترکیب اِن سے ضرور پوچھوں گا۔

"تو مولوی صاحب نے سچ مُچ کوئی ترکیب بتائی تھی یا یُوں ہی ٹال دیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"ترکیب بتائی تھی، جناب۔ اور وہ ترکیب واقعی ایسی تھی کہ اُس پر عمل کر کے عِلم حاصِل کرنا میرے لیے بالکُل آسان ہوگیا۔ میں نے بِالکُل آسانی سے ایم کام کیا اور بینک کا مینجر بن گیا۔ کہو تو وہ ترکیب تمہیں بھی بتا دوں؟" صِدّیقی صاحِب نے کہا "مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ترکیب اِتنی آسان ہے کہ ہر آدمی اُس پر عمل کر سکتا ہے۔ میں نے ٹھیک پندرہ دن بعد مولوی صاحِب کو یاد دلایا تو وہ کہنے لگے کہ وہ ترکیب ہم ضرور بتائیں گے۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ بات لکھ کر تو نہیں رکھ لی تھی کہ پندرہ دن بعد ہم سے پوچھو گے؟

"بِالکُل نہیں، جناب بس یہ ارادہ کر لیا تھا کہ آپ کو ضرور یاد دلاؤں گا"۔

مولوی صاحِب ہنستے ہوئے بولے "بس، بیٹا، وہ ترکیب یہی ہے کہ جو بات سُنو یا پڑھو، اُسے یاد رکھنے کی کوشش کرو۔ جو بچّے یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کا حافِظہ کم زور ہے، وہ دراصل بے پروا ہوتے ہیں۔ اُن کی نظریں ضرور کتاب پر ہوتی ہیں، لیکن دھیان کھیل کی طرف ہوتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ بیماری کی وجہ سے بھی حافِظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں علاج کرانا چاہیے۔ لیکن زیادہ بچّے بے پروائی کی وجہ سے نالائق رہ جاتے ہیں، اور تم اِنہی میں سے ہو۔ اب پکّا وعدہ کرو کہ آیندہ ہر بات خوب غور سے سُنو گے، کتاب خوب توجّہ سے پڑھو گے اور سُنی ہوئی اور پڑھی ہوئی باتوں کو خوب کوشش کر کے یاد رکھو گے۔

"اِس کے عِلاوہ ایک ضروری بات یہ ہے کہ اپنی عادتوں کو اچھا بنانے کی کوشش کرو گے۔ اِن پندرہ دنوں میں ہمیں یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تُم جھگڑالُو اور شرارتی بھی بہُت ہو۔ ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ یہ خراب عادتیں چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اِن بُرائیوں میں بڑھتے چلے جاؤ گے اور دوسرے لوگ تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے جیسا بُروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اچھّے بنو گے تو دوسرے بھی تم سے اچھّا سلوک کریں گے۔ کیا ہماری یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہے؟"

میں نے جلدی سے کہا "جی، آگئی ہے، اور اِن شاء اللہ میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ اچھّا بنانے کی کوشش کروں گا"۔

"اور یہ باتیں واقعی آپ کی سمجھ میں آگئی تھیں؟" میں نے سوال کیا۔

"نہ آتیں تو تم ہمیں اِتنے بڑے عُہدے پر کیسے دیکھتے۔ ہم تو ویسے ہی ہوتے جیسا تم نے ہمیں اِسکول میں دیکھا تھا اور تمہارے اندازے کے مُطابِق اِسٹیشن پر لوگوں کا سامان ڈھو رہے ہوتے یا سبزیوں کا ٹوکرا سر پر اُٹھائے گلی گلی پھِر رہے ہوتے"۔

یہ کہ کر صِدّیقی صاحِب زور سے ہنسے، میں بھی ہنسا لیکن میں اِس ہنسی میں دل سے شامل نہ تھا۔ میرے دماغ میں یہ بات گونج رہی تھی کہ انسان کو اللہ پاک نے واقعی بہُت قوّتیں دی ہیں۔ وہ ذرا کوشش کرے تو اپنی بُری حالت کو اچھّی حالت میں بدل سکتا ہے۔ اُس وقت صدّیقی صاحِب کا چہرہ مجھے بہُت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ وہ سچ مُچ چیمپئن لگ رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنی غلط عادتوں کو شکست دے دی تھی۔

پھلوں کا جادو

Sharjeel Ahmed

فرحت شاہ جہان پوری

کیلا، امرُود، مالٹا کھاؤ
سنگتروں سے بھی شوق فرماؤ
رنگ و خوش بُو سے جگ مگاتے پھل
دِل تو کیا رُوح کو لُبھاتے پھل
یہ حَسیں پھل خدا کی نعمت ہیں
پھل تو یہ موسموں کی دولت ہیں

سیب پیارا ہے، دِل کی طاقت ہے
کھا کے دیکھو یہ اِک کرامت ہے

کھاؤ تربُوز، گرما اور انگور
کھاؤ خربوزہ، ککڑیاں بھرپُور
آم کی فصل کا تو کیا کہنا
یہ ہے باغوں کا دِل کُشا گہنا

آم سا کوئی پھل نہیں دیکھا
جان دیتے ہیں اِس پہ شاہ و گدا[1]

کھاؤ پھل تاکہ اچھی ہو صحّت
اچھی صحّت تو ہے بڑی نعمت
زِندگی کا سِنگھار صحّت ہے
جان و دِل کی بہار صحّت ہے

(1) بھکاری

پیٹو رانی

رانی بلا کی پیٹو تھی۔ ہر وقت 'بکری کی طرح' کھاتی رہتی تھی۔ امّی نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح یہ بُری عادت چھوڑ دے، لیکن......

اُسی دن ، سہ پہر کو
ہم بیگم حمید کے گھر جا رہے ہیں. اُن کی بیٹی سونیا کو تصویریں جمع کرنے کا شوق ہے. شاید تمھیں بھی یہ شوق ہو جائے.
نہیں. اب تم کچھ نہیں کھاؤ گی.
بیگم حمید کے گھر
تصویریں جمع کرنا بہت اچھا مشغلہ ہے. رانی، تم بھی تصویریں جمع کرنا.
آہا! کتنی اچھی تصویریں ہیں. میں بھی تصویریں جمع کروں گی
واہ وا! رانی پرانے رسالوں سے تصویریں کاٹ رہی ہے.
کچھ دیر بعد
امّی ، ابّو ، چل کر دیکھیے. میں نے اپنے کمرے کی دیوار پر کتنی خوب صورت تصویریں لگائی ہیں!
اُف! میرے اللہ!

Sharjeel Ahmed

درسِ قرآن

قُربانی کا اصل مقصد

بچّوں کے لیے درسِ قرآن میں اِس دفعہ ہمارا موضوع ہے: قربانی کا اصل مقصد۔ موضوع کی تشریح کے لیے ہم نے آخری پارے کی سُورۃ کوثر کی دوسری آیت کا اِنتخاب کیا ہے جو یوں ہے:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝

اِس آیتِ مبارکہ کا لفظی ترجمہ ہے: "اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور قربانی دو"۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس حکم کے تاریخی پس منظر سے تو آپ پہلے ہی سے واقف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت اِبراہیمؑ کو حکم ہوا تھا کہ اپنے پیارے بیٹے حضرت اِسماعیلؑ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کیا جائے۔ آپ نے اِس حکم کی تعمیل کا تہیّہ کر لیا۔ وہ اِسماعیلؑ کو ساتھ لے کر قربانی کی نیت سے گھر سے چل نکلے۔ قربانی اور ایثار کے اِس عظیم جذبے سے خوش ہو کر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ بیٹے کی قربانی کی اب ضرورت نہیں۔ فقط ایک مینڈھا ذبح کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اِس حکم کی تعمیل کر دی۔

مسلمان اُس دن سے حضرت ابراہیمؑ کی اِس سنّت کی ہر سال یاد تازہ کرتے ہیں، اور حج کے اِختتام پر تمام مسلمان اللہ تعالیٰ کے نام پر مختلف جانوروں کی قربانی دیتے ہیں۔ جو لوگ حج پر نہیں جا سکتے، وہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر اپنے اپنے ملکوں اور اپنے اپنے گھروں میں ہی قربانی دیتے ہیں۔

وہ اِس نیک کام سے اِس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیّار ہیں۔ اور یہی قربانی کا اصل مقصد ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

سنہری چڑیا نے کہا:

رحمان کے بندے کون ہیں؟

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

پیارے بچّو' یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ سارے انسان اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ سب کا ربِّ رحمان ہے۔ لیکن معلوم یہ کرنا ہے کہ حقیقت میں اُس کے بندے کون ہیں؟

پہلے میں آپ کو اِن تین الفاظ بندہ' رب اور رحمان کے معنی بتاتی ہوں۔

(1) بندہ کو عربی میں عبد کہتے ہیں' جیسے عبدُاللہ' اللہ کا بندہ یا عبدُالرّحمان' رحمان کا بندہ۔ عبد یا بندے کا مطلب ہے: غلام یا محکوم یعنی اپنے آقا یا مالک کا حکم بجا لانے والا' فرماں بردار' بندگی کرنے والا۔

(2) رب کے معنی ہیں' پرورش کرنے والا یا پروردگار اور آقا و مالک۔

(3) رحمان کے معنی ہیں' اللہ یا رب جو اپنے بندوں سے بہُت زیادہ پیار کرنے والا' اُن پر بے حد رحم و کرم کرنے والا اور ان کو نعمتوں سے نوازنے والا ہے۔ رحمان اللہ تعالیٰ کی اہم ترین صِفَت ہے۔

ربِ رحمان نے اپنی آخری کتاب (قُرآنِ پاک) میں' جو اُس نے اپنے آخری رسول حضرت محمّد مُصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمائی تھی' بتایا ہے کہ حقیقت میں اُس کے بندے کون ہیں۔ وہ سُورتِ فرقان میں فرماتا ہے کہ اُس کے بندے وہ ہیں:

(1) جو زمین پر (غرور و تکبُّر سے نہیں بلکہ) سیدھے سادے طریقے سے چلتے پھرتے ہیں اور جب جاہل یعنی نادان اور اُجڈ لوگ اُن کے مُنہ آتے ہیں تو وہ (اُن سے بحث کرنے کے بجائے اُنہیں صرف) سلام کہتے ہیں۔

(2) جو اپنے پروردگار کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ اِس کا مطلب ہے کہ وہ راتوں کو صلوٰۃ یعنی نماز قائم کرتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔

(3) جو یہ دعا مانگتے رہتے ہیں "اے ہمارے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچانا۔ دوزخ کا عذاب یقیناً جان کا لاگو ہے' اور دوزخ بڑی اذیّت ناک جگہ ہے۔

(4) جو روپیہ پیسہ خرچ کرتے ہیں تو نہ تو فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی' بلکہ اِعتدال سے خرچ کرتے ہیں۔

(5) جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو نہیں پکارتے (اِمداد و حاجت روائی کے لیے)۔

(6) اللہ نے جس جان یا جان دار کو حرام کیا ہے (یعنی اُن کو قتل کرنے سے منع کیا ہے) اُسے ناحق ہلاک نہیں کرتے (البتّہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مُطابِق ایسا کرتے ہیں)۔

(7) اور نہ وہ بدکاری ہی کرتے ہیں۔ جو کوئی یہ حرکت کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے روز اُسے بہت زیادہ عذاب دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ عذاب میں ذِلّت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ البتّہ جس نے (اِن گناہوں کے بعد نادِم و پشیمان ہوکر) توبہ کرلی (یعنی پھر ایسے گناہ نہ کرنے کا پکّا

عہد کرلیا) اور ایمان لایا، یعنی دل کے اِطمینان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام اور قوانین کو تسلیم کرلیا، اور اُن کے مطابق نیک عمل کرنا شروع کر دیے تو اللہ ایسے لوگوں کی بُرائیوں کو بھلائیوں میں بدل دے گا۔ اور اللہ تو ہے ہی جُرم و گناہ بخشنے والا اور بڑا ہی ترس کھانے والا اور رحم و کرم اور مُعاف کرنے والا۔

(8) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے، یعنی جھوٹی گواہی نہیں دیتے، اور

(9) جب اُن کا گزر (اِتفاق سے) کسی بے ہُودہ چیز یا چیزوں کے پاس ہوتا ہے تو وہ شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں (یعنی اُس جگہ ٹھہرتے نہیں اور جو کچھ وہاں ہو رہا ہوتا ہے اُسے دیکھتے نہیں)۔

(10) جنھیں ان کے پروردگار کی باتیں اور احکام سنائے جاتے ہیں تو وہ بہرے اور اندھے بن کر نہیں رہ جاتے۔ اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے اُس کے احکام اور تعلیمات کو غور کے کانوں سے سنتے اور اس کی نشانیوں کو غور کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن جو ربِّ رحمان کے سچّے بندے نہیں ہوتے، وہ اس کے احکام اور باتوں کو نہ تو غور سے سنتے ہیں اور نہ اس کی نشانیوں کو غور سے دیکھتے ہیں۔ ایسے نا فرمان لوگوں کو اللہ تعالیٰ بہرے، گونگے اور اندھے کہتا ہے۔

(11) جو یہ دعا مانگا کرتے ہیں: اے ہمارے پروردگار و مالک! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔

آنکھوں کی ٹھنڈک کا مطلب ہے: اِطمینان اور سچی خوشیاں یا ایسی باتیں جن سے کلیجا ٹھنڈا ہو جائے اور

(12) ہمیں متّقی لوگوں کا اِمام، یعنی سرپرست و پیشوا بنا دے۔ قُرآن مجید کی رُو سے متّقی وہ شخص ہوتا ہے جسے ہدایت کی سچّی آرزو اور گُم راہی کا خوف ہو۔

سنہری چڑیا قدرے توقّف کے بعد بولی:

"بچّو! اب اللہ تعالیٰ اپنے ان سچّے بندوں کے اجر اور انجام کے متعلّق فرماتا ہے:

یہ ہیں وہ لوگ (یعنی رحمان کے بندے) جن کو اپنے صبر کا پھل ایک تو یہ ملے گا کہ ان کو بلند مقام دیا جائے گا، اور دوسرے ان کو ہمیشہ کی خوش گوار زندگی اور امن و سلامتی سے نوازا جائے گا۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ یعنی جنّت رہنے کی بڑی ہی حسین جگہ ہے۔

بچّو! آپ نے دیکھا کہ اللہ میاں کن لوگوں کو اپنے فرماں بردار بندے کہتا ہے اور ان کو کتنی اعلیٰ اور حسین نعمتیں دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ اُمّید ہے آپ بھی اپنے رب کے فرماں بردار بندے اور جنّت کے وارث بننے کی کوشش کریں گے۔

پہاڑ

زمین کی سطح کے وہ حصّے جو سمندر کی سطح سے تین ہزار فٹ سے زیادہ اُونچے ہیں، پہاڑ کہلاتے ہیں۔ بعض پہاڑ ہماری زمین کے ساتھ ہی وجود میں آئے، یعنی کروڑوں سال پہلے جب زمین بنی تو اُس پر بعض مقامات پر ٹیلے سے بن گئے، جو آہستہ آہستہ اُونچے ہوتے گئے۔

بعض پہاڑ زمین بننے سے بہت عرصے بعد وجود میں آئے۔ یہ اُن چٹانوں سے بنے ہیں جو زمین کے اندر تھیں۔ جب یہ چٹانیں زمین کی حرارت سے پگھلیں تو اُن کا لاوا زمین کا پوست (چھال) پھاڑ کر اُوپر آگیا اور ٹھنڈا ہو کر پہاڑ بن گیا۔ پہاڑوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ پہاڑوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں (یعنی یہ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں) لیکن اِن تبدیلیوں کا عرصہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ہم اِس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

دُنیا کے بعض پہاڑوں کی بلندی کم ہو رہی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی چوٹیوں پر برف گرتی اور پگھلتی رہتی ہے جس سے پہاڑ کی چٹانیں ٹوٹتی پھوٹتی رہتی ہیں۔

دوسرا فرض

میرزا ادیب

اُس روز علی اکبر کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ اُس کے سر کے زخم کی پٹّی اُتر گئی تھی۔ بازو کے زخم کا بھی یہی حال تھا۔ البتّہ اُس کی پیٹھ کے زخم پر ابھی پٹّی بندھی تھی اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کم از کم ایک ہفتہ اور اُسے ہسپتال میں رہنا پڑے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے ڈاکٹر صاحب ہسپتال چھوڑنے کی اِجازت دے دیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب اِس کے لیے تیار نہیں تھے۔ البتّہ ہسپتال کے باغ میں وہ چل پھر سکتا تھا۔

علی اکبر سے چھوٹے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دو دن اور رُک جاؤ۔ اِس کے بعد ڈاکٹر صاحب جانے کی اجازت دے دیں گے۔ لیکن وہ اُسی دن ہسپتال سے جانا چاہتا تھا۔ آخر کیوں؟

اِس کی ایک خاص وجہ تھی۔ اُس کے پاس کسی کی امانت تھی جسے وہ جلد از جلد پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ دوبئی میں ایک اِسٹور میں کام کرتا تھا۔ اِس اِسٹور کے مالک نے اُسے ایک بکس دیا تھا جسے اِسٹور کے مالک کے بھائی کے گھر پہنچانا تھا۔ جب وہ دوبئی سے چلا تھا تو یہ امانت پہنچانے کے لیے اُس کے پاس پچیس دن تھے۔ لیکن بد قسمتی یہ ہوئی کہ جب وہ لاہور اِیئرپورٹ سے رکشے میں بیٹھ کر روانہ ہوا تو ابھی نِصف راستہ بھی طے نہ ہوا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک ٹیکسی رکشے سے ٹکرا گئی اور وہ رکشے سے نکل کر سڑک پر گر پڑا۔ زخموں سے اُس کا بُرا حال تھا، مگر اِس بُری حالت میں بھی اُس نے بکس کو دونوں ہاتھوں سے تھامے رکھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اُسے نہ چھوڑا۔

اُدھر سے ایک کار جا رہی تھی۔ کار والے نے اپنی کار فوراً روک لی، زخمی علی اکبر کو کار میں بٹھایا اور اُسے قریبی ہسپتال میں پہنچا دیا۔ ڈاکٹروں نے اُس کی مرہم پٹّی کی اور اُس کی حالت بہتر ہونے لگی۔ لیکن جب تک وہ امانت اُس شخص کے حوالے نہ کر دے جس کے لیے یہ دی گئی تھی، اُس کی بے چینی دُور نہیں ہو سکتی تھی۔

علی اکبر کو اِسٹور کے مالک نے بکس دیتے ہوئے کہا تھا "دیکھو بیٹا، تم جانتے ہو کہ میں بیمار ہوں۔ سفر کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ پھر اِسٹور چلانے کی ذمّے داری تمہارے سپُرد نہیں کی جا سکتی کیوں کہ تم ابھی نا تجربہ کار ہو۔ لاہور میں میرے سگے بھائی کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔ مجھے اُس کی مدد کرنی چاہیۓ اور میں کپڑے، زیورات اور کچھ رقم دے کر ہی اُس کی مدد کر سکتا ہوں۔ علی اکبر بیٹا، مجھے تم پر پورا پورا اِعتماد ہے۔ یہ فرض تم بڑی اچھی طرح ادا کر سکتے ہو"۔

اور علی اکبر نے جواب دیا تھا "میں بڑی خوشی سے یہ

فرض ادا کروں گا۔ جو کچھ بھی آپ مجھے دیں گے، آپ کے بھائی کے گھر جا کر اُن کے حوالے کر دوں گا"۔

اُس کے یہ الفاظ سُن کر اِسٹور کا مالک خوش ہو گیا تھا۔ اُس نے کہا تھا "مجھے تم سے یہی اُمید تھی"۔ اور اُس نے اپنے بھائی کے نام ایک رُقعہ لکھ کر علی اکبر کے حوالے کر دیا تھا۔ اگر علی اکبر اِس حادثے میں زخمی ہو کر ہسپتال نہ پہنچ جاتا تو وہ امانت دے کر اپنے گاؤں جاتا اور رشتے داروں سے مل کر دوبئ واپس چلا گیا ہوتا۔ مگر اِس حالت میں وہ اپنا فرض کیوں کر ادا کر سکتا تھا۔ یہی اُس کی بے قراری کی وجہ تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ امانت اِسٹور کے مالک کے بھائی تک کس طرح پہنچائے؟ جب وہ دوبئ کے اِیئر پورٹ کی طرف جا رہا تھا تو اِسٹور کے مالک نے اُسے بتایا تھا "میری بھتیجی کی شادی اِس مہینے کے آخری ہفتے میں ہوگی۔ ابھی کافی دن پڑے ہیں۔ یہ چیزیں جلد وہاں پہنچا دی جائیں گی تو شادی کے اِنتظامات میں آسانی رہے گی"۔ اور علی اکبر خوب جانتا تھا کہ مہینے کا آخری ہفتہ ایک دن کے بعد شروع ہونے والا ہے۔

"یہ امانت آج ہی وہاں پہنچ جانی چاہیئے" اُس کی اپنی خواہش تو یہی تھی لیکن یہ خواہش پوری کیوں کر ہو سکتی تھی؟

اُس نے ایک بار پھر سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر نہ صرف باغ کا چکّر لگایا بلکہ ہسپتال کے بڑے دروازے سے بھی نکل کر چند قدم آگے چلا اور پھر واپس آ گیا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ چلنے پھرنے میں اُسے کوئی دِقّت تو نہیں ہوگی۔ اور اُس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اُسے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔

"میں آسانی سے چودھری اِرشاد کے گھر جا سکتا ہوں" اُس نے دل میں کہا۔ چودھری اِرشاد اِسٹور کے مالک کے بھائی کا نام تھا جہاں اُسے امانت پہنچانی تھی۔

وہ سیڑھیوں کی طرف چلتے چلتے رُک گیا۔ پانی کی ایک بُوند اُس کی ناک پر پڑی تھی۔ اُس نے اُوپر دیکھا۔ فضا میں بادل تیر رہے تھے اور دُور بادلوں میں سے پھیکا سا سورج نُمایاں ہو رہا تھا۔ "ابھی بارش نہیں ہوگی" یہ سوچ کر وہ مُطمئن ہو گیا۔

وہ اپنے بیڈ پر گیا تو اُس کے قریب لیٹا ہوا ایک بوڑھا بیمار اپنا سر ہلاتے ہوئے گویا کہ رہا تھا "میں جانتا ہوں تمہاری کیا حالت ہے"۔ علی اکبر مسکرایا تو وہ بولا "بڑی فکر ہے، امانت پہنچانے کی؟" وہ جانتا تھا کہ علی اکبر کیوں بے چین ہے۔ علی اکبر نے سر ہلا دیا۔

"جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ ڈاکٹر صاحِب نے تمہیں چلنے پھرنے کی اِجازت دے دی ہے"۔

علی اکبر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وارڈ میں اُس وقت کوئی نرس نہیں تھی۔ اُس نے سرہانے کے پاس رکھے ہوئے اِسٹُول پر سے بکس اُٹھایا تو اُسی وقت نرس آ گئی۔ اُس نے علی اکبر کو جاتے ہوئے دیکھ کر کہا "جلدی آجانا۔ یہ بہُت ضروری ہے۔ ابھی تمہاری حالت اِس قابل نہیں ہے کہ زیادہ دیر تک چلو پھرو" علی اکبر نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جلد ہی واپس آجائے گا۔

تانگے کا اِنتظار کرنے کی بجائے وہ پیدل ہی چل پڑا۔ وہ اگرچہ ایک گاؤں کا رہنے والا تھا مگر اُس نے تعلیم لاہور میں پائی تھی۔ اِس لیے اِس شہر کے تمام دروازوں سے واقِف تھا۔ اُسے بھاٹی گیٹ کے اندر بازار حکیماں میں جانا تھا۔ قدم اُٹھاتے ہوئے اُس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ بیماری کی وجہ سے وہ بہُت کم زور ہو گیا تھا۔ تیز چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی، اور دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ بادل زور سے گرجا اور ساتھ ہی بارش ہونے لگی۔

ابھی وہ ہسپتال سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ واپس جانے میں کوئی مشکل نہ تھی۔ لیکن اُس کے قدم رُک نہ

سکے۔ اُس نے اِرادہ کرلیا کہ وہ آگے ہی بڑھتا چلا جائے گا۔ واپس نہیں ہوگا۔

اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا' ہوا تیز ہونے لگی تھی اور بارش میں لحہ بہ لحہ اِضافہ ہو رہا تھا۔ ایک جگہ اُس نے محسوس کیا کہ اب آگے چلنا مشکل ہے۔ اُس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگی تھیں۔ کپڑے بِھیگ کر بوجھل ہوگئے تھے۔ چند لمحے رُک کر اُس نے خود کو سنبھالا اور پھر چلنے لگا۔ اُس کا سانس رُکنے لگا تھا۔ امانت اُس نے اپنے سینے سے لگا رکھی تھی۔

اچانک ایک خیال اُس کے ذہن میں آیا "اگر میں گر پڑا تو کوئی شخص یہ بکس اُٹھا لے گا اور میری ساری محنت اکارت جائے گی"۔ اِس خیال نے اُس کے اندر حرارت سی پیدا کر دی۔ اُس نے اپنا سفر جاری رکھا۔

اب وہ بھاٹی دروازے کے اندر آگیا تھا۔ اُس کی منزل

زیادہ دور نہیں تھی۔ مگر حالت یہ تھی کہ اسے ایک ایک قدم اُٹھانا بھی دوبھر ہوگیا تھا۔ اِسی لمحے بارش اور تیز ہوگئی۔ وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ اُسے کُوچہ فقیرخانہ میں جانا تھا۔ مگر وہ یہ نہ جانتا تھا کہ یہ کُوچہ ہے کہاں۔ اچانک اُس سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی رُکی۔ اُس نے گاڑی کی تیز روشنی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

"مجھے چودھری اِرشاد" اُس نے اپنا فِقرہ مکمّل نہیں کیا تھا کہ گاڑی والے نے ایک مکان کی طرف اِشارہ کیا۔ ایک مِنٹ کے بعد وہ ایک دو منزلہ مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ کھُلا اور ایک صاحِب دروازے پر آئے۔

"آپ کا نام چودھری اِرشاد احمد ہے؟" علی اکبر نے پوچھا۔

"جی ہاں' فرمایئے؟" اُنھوں نے کہا۔

علی اکبر نے کچھ کہے بغیر بکس اُن کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" چودھری اِرشاد احمد نے سوال کیا۔

"یہ آپ کی امانت ہے۔ دوبئی سے آپ کے بھائی چودھری نیاز احمد نے بھیجی ہے" علی اکبر نے بتایا۔

چودھری اِرشاد نے بکس لے کر کہا "شکریہ۔ اندر آجایئے۔ بُری طرح بھیگ گئے ہیں"۔

"مُعاف کیجیے۔ میرے پاس وَقت نہیں ہے" علی اکبر بولا۔

"جی؟" چودھری اِرشاد احمد کو اُس کی بات سُن کر حیرت ہوئی۔

"دیکھیے' امانت آپ تک پہنچانا میرا ایک فرض تھا" علی اکبر کہنے لگا "ابھی مجھے اپنا دُوسرا فرض ادا کرنا ہے۔ ہسپتال سے آ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحِب نے مجھے ہسپتال سے زیادہ دیر باہر رہنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ مہربانی کر کے مجھے اپنا یہ دوسرا فرض ادا کرنے دیجیے"۔

بارش تھم چکی تھی' مگر ہوا کے تیز و تُند جھونکے چل رہے تھے اور علی اکبر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا ہسپتال کی طرف جا رہا تھا!

نظر کا دھوکا

سامان : کاغذ - قینچی - پنسل - رُولر - پر کار -

ہم اکثر کہتے ہیں "جب تک میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لُوں، کیسے یقین کروں"؟ لیکن کیا ہم اپنی نظر پر یقین کر سکتے ہیں؟ ہماری نظر اکثر ہمیں دھوکا دے جاتی ہے۔

مثلاً (1) سامنے کھنچے ہوئے دو خطوں (لکیروں) کو

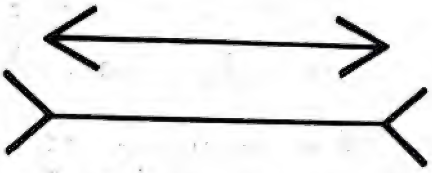

دیکھیے اور بتائیے کہ اِن دونوں میں سے کون سا خط لمبا ہے؟ آپ کہیں گے نیچے والا خط لمبا ہے اور اُوپر والا چھوٹا۔ رُولر لیجیے اور دونوں خطوں کو ناپیے۔ دونوں خط بِالکُل ایک جیسے لمبے ہیں۔ یہ نظر کا دھوکا تیروں نے پیدا کیا تھا۔

(2) یہ ایک ہیٹ کی تصویر ہے۔ غور سے دیکھیے اور بتائیے کہ کیا اِس کی لمبائی چوڑائی سے زیادہ ہے؟ آپ

کہیں گے کہ لمبائی چوڑائی سے زیادہ ہے۔ جی نہیں۔ رُولر سے ناپ کر دیکھیے۔ یہ خیال رہے کہ چوڑائی ناپتے وقت نچلے کناروں کا درمیانی فاصلہ ناپیے گا۔

(3) ایک کاغذ لے کر اُس کے ایک جیسے لمبے تین ٹکڑے کاٹ لیں۔ تینوں کی چوڑائی بھی ایک جیسی ہونی چاہیے۔ اِس کے بعد اِن میں سے ایک ٹکڑے کی چوڑائی آدھی کر دیں۔ اب اِن تینوں کو تین مختلف طریقوں سے رکھیں۔

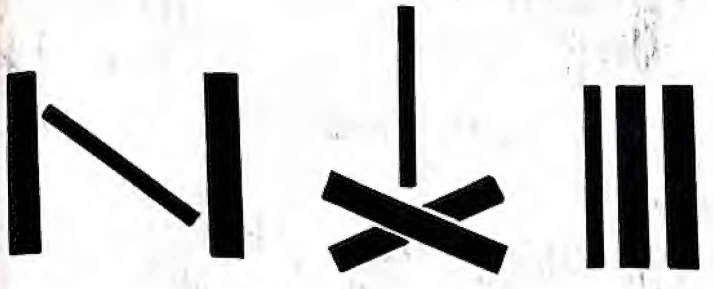

بائیں ہاتھ کی پہلی ترتیب کو دیکھ کر آپ کے دوست کہیں گے کہ درمیانی ٹکڑے کی لمبائی باقی دو سے زیادہ ہے اور دائیں طرف والی ترتیب کو دیکھ کر وہ کہیں گے کہ لمبائی برابر ہے۔ حقیقت کیا ہے؟ آپ خود جانتے ہیں۔

(4) نیچے کی تصویر میں سیڑھی کو دیکھیے۔ یہ اُلٹی نظر آ رہی ہے۔ اگر آپ رسالے کو اُلٹا رکھ کر دیکھیں گے تو پھر بھی یہ اُلٹی نظر آئے گی۔ لیکن آپ رسالے کو اُلٹا کیے بغیر بھی سیڑھی کو سیدھا دیکھ سکتے ہیں۔ نیچے سے چلیے اور باری باری اُن سیاہ مقامات کو دیکھتے جائیے جہاں پاؤں رکھتے ہیں۔ آپ کو سیڑھی سیدھی نظر آئے گی۔

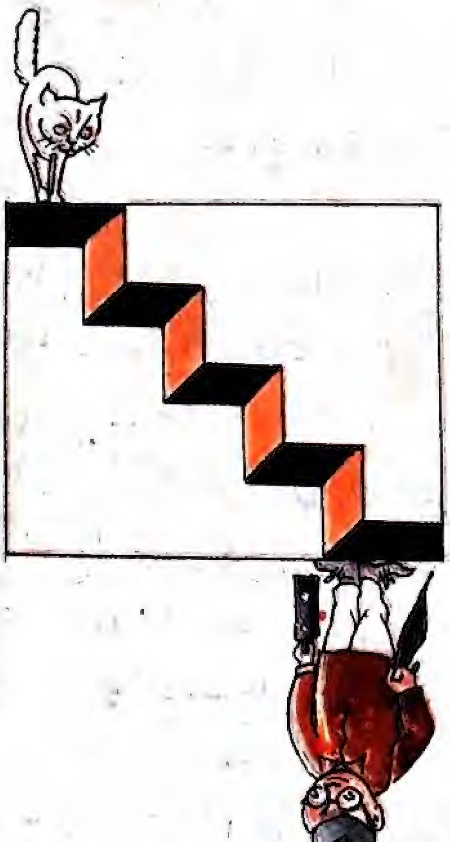

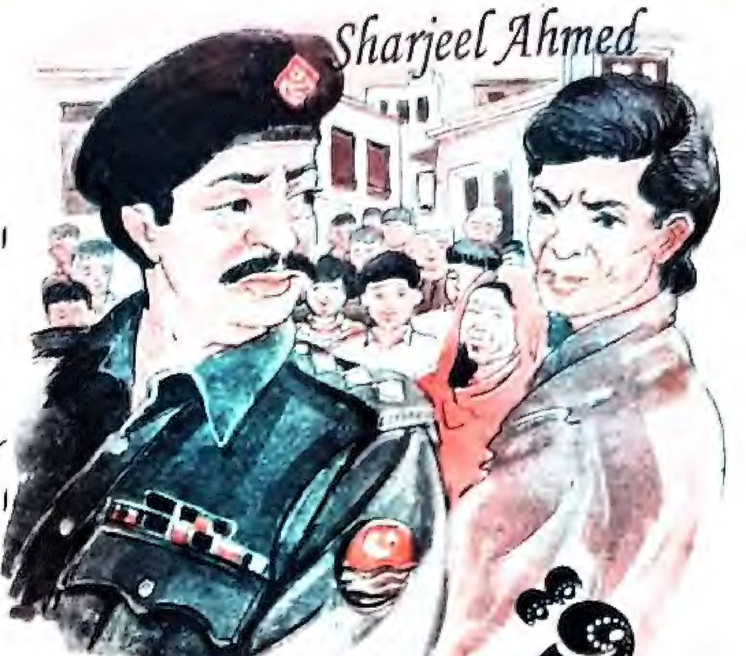

قیمت

اِشتیاق احمد

"آپ نے اکبر کو ہیروئن بیچنے کے جُرم میں گرفتار کیا ہے؟"

اِنسپکٹر ارشد نے چونک کر سر اُٹھایا۔ اُن کی بیگم سوالیہ انداز میں اُن کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ نہ صرف بیگم بلکہ اُن کے تینوں بچّے بھی اُنہیں گھور رہے تھے۔

"ہاں، میں نے اُسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے"۔

"ہائیں! اُس بے وقوف نے اپنے ہاتھ بھی رنگے ہوئے تھے؟"

"اوہو! بیگم۔ تم تو مُحاورے کی بھی ایسی کی تیسی کر دیتی ہو۔ میرا مطلب ہے، وہ اُس وقت ہیروئن فروخت کر رہا تھا جب میں نے اُسے پکڑا"۔

"چلیے، مان لیتی ہُوں۔ لیکن میری، اِن تینوں بچّوں کی اور پُورے محلّے کے لوگوں کی آپ سے بس ایک ہی درخواست ہے، اور وہ یہ کہ اُسے چھوڑ دیں"۔

"معلوم ہوتا ہے، میرے عِلاوہ سب لوگ گھاس کھا گئے ہیں" اِنسپکٹر ارشد نے مُنہ بنایا۔

"آپ گھاس کی نہیں، اکبر کی، بلکہ اکبر کی بھی نہیں، اُس کی والِدہ کی بات کریں"۔

"اُس کی والدہ کی کیا بات ہے؟" وہ چونک کر بولے۔

"اکبر کے عِلاوہ اِس بھری دُنیا میں اِس بوڑھی ماں کا اور کوئی نہیں۔ اب وہ کس کے سہارے جیے گی؟"

"لیکن اِس میں میرا کیا قصُور ہے؟"

"آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آج صبح سارے محلّے والے ہمارے گھر آئے تھے۔ سب نے پُرزور انداز میں درخواست کی تھی کہ آپ اکبر کو چھوڑ دیں"۔

"بیگم، یہ خالہ جی کا گھر نہیں ہے"۔

"میں نے یہ بات کب کہی؟ یہ تو ہمارا گھر ہے"۔

"اوہو! ایک تو میں بات بے بات مُحاورے بول جاتا ہُوں، اور ایک تم ہو کہ مُحاوروں کی بات سِرے سے سمجھتی ہی نہیں"۔

"آپ کو مُحاورے سُوجھ رہے ہیں اور اُس بے چاری کا رو رو کر بُرا حال ہے۔ پُورا محلّہ ہمیں بُرا سمجھ رہا ہے"۔

"اور ہیروئن بیچنے والے کو اچّھا؟ کمال ہے"! اِنسپکٹر ارشد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اِس کا مطلب ہے، آپ نہیں مانیں گے"۔

"بات ماننے نہ ماننے کی نہیں۔ تیر میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اب کمان میں واپس تو آنے سے رہا"۔

"تو آپ نے تیر بھی چلایا تھا اُس پر" بیگم حیران رہ گئیں۔

"دیکھیں، بیگم۔ خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ قانون کے مُحافِظ کے اپنے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں"۔

"نہیں تو، ماشاء اللہ آپ کے ہاتھ تو کُھلے ہیں اب آپ نے جھوٹ بھی بولنا شروع کر دیا، وہ بھی اِس اکبر کی خاطر؟"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ عقل کے ناخُن لو"۔

"لیکن عقل کے ناخنوں پر نیل پالش کب لگتی ہے؟"

عین اُسی وقت اُن کے دروازے پر زوردار دھڑ دھڑ ہونے لگی۔

"اوہو! کیا طوفانِ بدتمیزی ہے!" اِنسپکٹر صاحب نے بُرا

سامنہ بنا کر کہا۔

"طوفان؟ نہیں تو" بیگم صاحبہ نے جلدی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر صاحِب دروازے کی طرف لپکے اُنہیں خوف تھا کہ کہیں دروازہ نہ توڑ دیا جائے۔ جوں ہی اُنہوں نے دروازہ کھولا' باہر پورا محلہ نظر آیا۔ اُنہوں نے پیچھے دیکھا تو وہاں بیگم اور بچّے نظر آئے۔ اُن سب کے ہاتھ جُڑے ہوئے تھے۔ سب کے سب ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔

"بی امّاں کے بیٹے کو چھوڑ دیں۔ ہم سب کی آپ سے درخواست ہے" محلّے والے ایک ساتھ بولے۔

"اور ہم سب کی بھی" پیچھے سے گھر والے بولے۔

آج اُنہیں محسوس ہُوا کہ کسی محلّے دار کو گرفتار کرنا کس قدر مُشکل کام ہوتا ہے۔ اُنہیں یہ اِحساس تک نہیں تھا کہ وہ کس مشکل میں پھنس جائیں گے۔ اُنہوں نے ہاتھ اُٹھا کر اُن سب کو خاموش کیا اور پھر بولے "دیکھیے' میری پوزیشن پر غور کیجیے"۔

"آپ ماشاء اللہ پولیس اِنسپکٹر ہیں۔ اِس سے اچّھی پوزیشن کیا ہوگی؟" ایک بوڑھے نے کہا۔

"لیجیے' میں آپ کے پیروں پر اپنی پگڑی رکھ دیتا ہُوں" ایک اور بڑے میاں بولے۔

"اور ہمارے پاس ٹوپیاں ہیں۔ہم یہ رکھ دیتے ہیں۔ جن کے پاس ٹوپیاں نہیں ہیں' وہ رومال نکال کر اِنسپکٹر صاحِب کے پیروں پر رکھ دیں" کسی نے کہا۔

"ارے! ارے!" وہ گھبرا گئے' بوکھلا گئے۔

"اور لیجیے۔ وہ بی امّاں بھی آگئیں' لاٹھی ٹیکتی ہوئی۔ آپ نے اِس بے چاری کے بُڑھاپے کی لاٹھی کو گرفتار کیا ہے۔ ذرا دیکھیے تو"۔

اِنسپکٹر صاحِب نے فوراً اُس طرف دیکھا۔ ایک سترّ سالہ بُڑھیا ہانپتی کانپتی چلی آ رہی تھی۔ سب نے اُسے راستہ دے دیا۔ وہ نزدیک آتے ہی اُن کے پیروں سے لپٹ گئی۔

"بیٹا' میرے لال کو چھوڑ دے۔ اِس کی جگہ مجھے جیل میں ڈال دے"۔

"جیل میں نہیں' بڑی امّاں' آپ کا بیٹا تو ابھی حوالات میں ہے" وہ جلدی سے بولے۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ سارے محلّے والے بھی کچھ نہیں جانتے۔ بیٹا' خود تمہارے گھر والے بھی کچھ نہیں جانتے۔ بس اکبر آجائے' شام سے پہلے پہلے"۔

"ہاں' بالکُل' بالکُل" سب ایک ساتھ بولے۔

"آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کچھ نہیں جانتے۔ آپ کو تو یہ تک معلوم نہیں کہ ایک پولیس افسر کے پیروں میں کس کس مجبوری کی بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں"۔

"بیڑیاں اور آپ کے پیروں میں؟ کیوں مذاق کرتے ہیں' انسپکٹر صاحِب۔ آپ اکبر کو چُٹکی بجاتے میں چھوڑ سکتے ہیں"۔

"اچّھا!" اُنہوں نے حیران ہو کر کہا اور چُٹکی بجائی۔

"دیکھیے' پھر مذاق۔ آپ کو اکبر کو چھوڑنے کا وعدہ کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ ہم سب یہاں سے نہیں جائیں گے۔ ہم یہیں بیٹھے رہیں گے اور بی امّاں بھی۔ یہ تو دے دیں گی جان' لیکن یہاں سے نہیں ہلیں گی"۔

اِنسپکٹر صاحِب کا دماغ گھوم گیا' عجیب مُصیبت میں مُبتلا ہوگئے تھے۔ آخر اُنہوں نے اِعلان کرنے کے انداز میں کہا "ٹھیک ہے۔ شام تک اکبر گھر آجائے گا۔"

"انسپکٹر صاحِب" کسی نے بلند آواز سے کہا۔

"زندہ باد!" سب نے گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا۔

اور پھر سب خوشی خوشی چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا کھاتے ہی اِنسپکٹر ارشد تھانے پہنچے اور اِس کے آدھ گھنٹے بعد اکبر گھر آگیا۔ سب اُس کے گِرد جمع ہوگئے۔ لگے اُچھلنے کُودنے' خوشیاں منانے۔

"اکبر' تم آگئے۔ آخر اِنسپکٹر صاحِب نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ وہ کتنے اچّھے ہیں' اور اکبر' تم کتنے بُرے ہو۔ وعدہ کرو کہ اب اِس کم بخت ماری ہیروئن کا کاروبار کبھی نہیں کروگے"۔

"خاموش!" اکبر نے چِلّا کر کہا۔ سب خاموش ہوگئے۔

اکبر کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

"یہ آپ لوگوں نے آخر کیا کیا؟" اُس نے کہا۔

"کیا کیا ہم نے؟ بات کیا ہے؟" لوگ بولے۔

"آپ لوگوں نے اِنسپکٹر صاحب کو اِس حد تک مجبور کر دیا۔ آپ نے نہ سوچا، نہ سمجھا، اُنہیں بالکل بے بس کر دیا۔ کچھ تو سوچا ہوتا۔ اُن کی بات سُنی ہوتی۔ ارے بابا، مجھے چھوڑنے کا اِختیار اُنہیں نہیں تھا۔ میرا فیصلہ تو عدالت میں ہونا تھا، اور آپ سب ہاتھ دھو کر اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ خدا آپ لوگوں سے سمجھے"۔

"چلو، شکر کرو۔ اب تو جیسے تیسے اُنہوں نے تمہیں چھوڑ دیا۔ اب لعنت بھیجو اِس کاروبار پر" ایک بوڑھے نے کہا۔

"اوہو! بڑے میاں، اُس پر تو میں نے گرفتار ہوتے ہی لعنت بھیج دی تھی۔ توبہ کر لی تھی۔ لیکن آپ لوگوں نے بُرا کیا، بہت زیادہ بُرا کیا بلکہ بہت زیادہ سے بھی زیادہ بُرا کیا"۔

"ارے! ارے! آخر ہم نے کیا کیا؟"

"آپ لوگ جانتے ہیں کہ مجھے رِہا کرنے کی اُنہیں کیا سزا ملے گی اب؟"

"کیا مطلب؟" لوگ چونکے۔

"ہاں، اب میری جگہ اُنہیں جیل جانا پڑے گا۔ اب وہ میری جگہ حوالات میں بند ہیں"۔

"کیا؟" وہ سب ایک ساتھ چلّائے۔

"اور نہیں تو کیا"۔

وہ سب سکتے میں آ گئے۔ پھر بی اماں آگے بڑھیں۔ اُنہوں نے اکبر کا ہاتھ پکڑا، بولیں "آؤ، بیٹا، میں تمہیں حوالات میں چھوڑ کر آتی ہوں۔ ہمیں تمہاری رِہائی اِس قیمت پر نہیں چاہیے۔ کیوں بھائیو؟"

"ہاں، بالکل، بالکل" وہ چلّائے۔

اور پھر پورا مجمع تھانے کی طرف چل پڑا۔ اِنسپکٹر ارشد واقعی حوالات میں بند تھے۔ قدموں کی آہٹ سُن کر اُنہوں نے اُن کی طرف دیکھا۔

"ہمیں مُعاف کر دیجیے۔ ہم نے آپ کی بات نہیں سمجھی۔ یہ رہا اکبر۔ اِسے حوالات میں بند کر دیجیے۔ آپ باہر آجائیے"۔

اِنسپکٹر ارشد کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے۔ اِس مجمعے میں اُنہیں اپنے بیوی بچّے بھی کھڑے نظر آئے۔ اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ کانسٹیبل حوالات کا دروازہ کھول رہا تھا، اکبر اندر جا رہا تھا اور انسپکٹر صاحب باہر آ رہے تھے۔ ایسے میں اُنہوں نے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"تم نے توبہ کر لی ہے۔ اب قانون تمہاری مدد کرے گا۔ فِکر نہ کرو۔ آپ سب بھی فِکر نہ کریں"۔

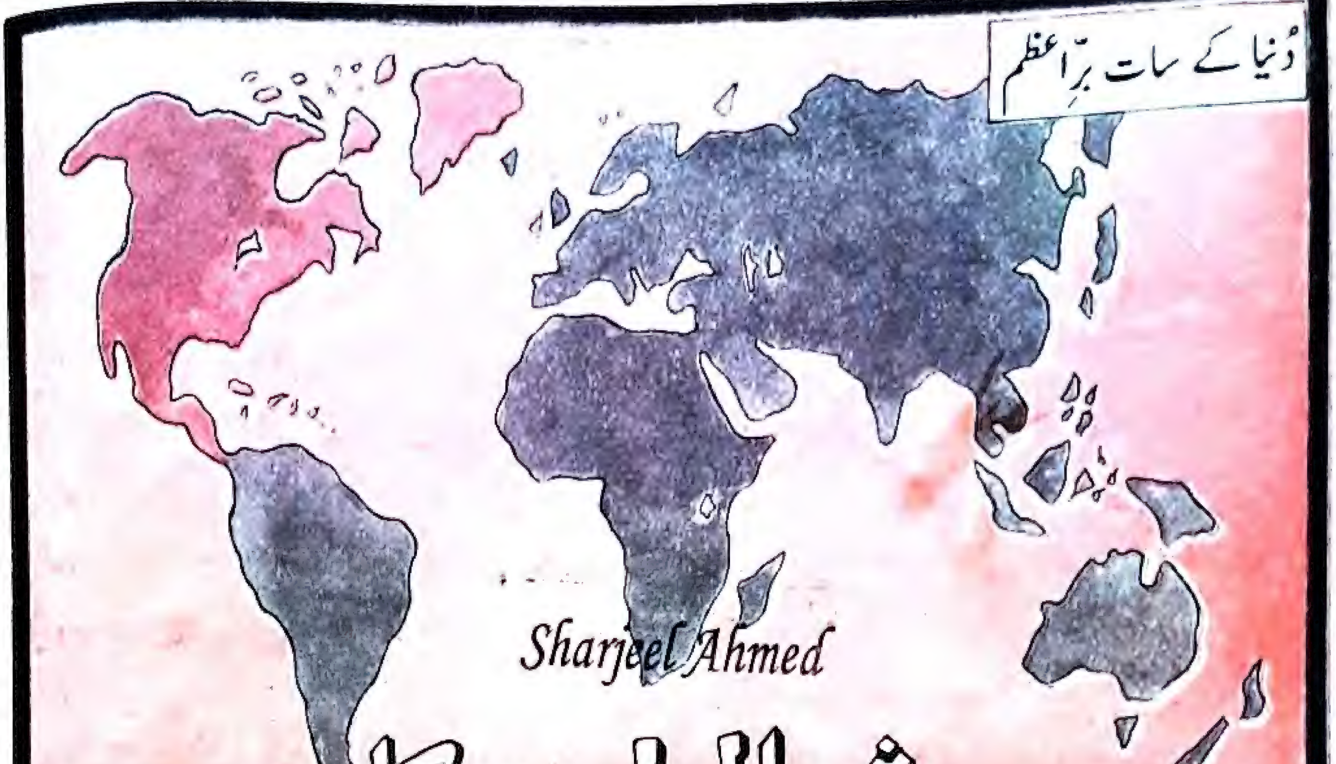

شمالی امریکا

شمالی امریکا، سات برّاعظموں میں، تیسرا سب سے بڑا برّاعظم ہے۔ صِرف ایشیا اور افریقہ کے برّاعظم اِس سے بڑے ہیں۔ یہ برّاعظم شمال میں قُطبِ شمالی کے مُنجمد علاقوں سے لے کر جنوب میں بُحیرۂ کیربیئن کے آس پاس کے گرم مرطوب علاقوں تک پھیلا ہوا ہے۔

برّاعظم شمالی امریکا میں دُنیا کا سب سے طاقت ور اور دولت مند ملک، ریاست ہائے مُتحدہ امریکا (یو۔ ایس۔ اے) اور رقبے کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک کینیڈا شامل ہے۔ گرین لینڈ، جسے بعض جغرافیہ دان دُنیا کا سب سے بڑا جزیرہ کہتے ہیں، اِسی برّاعظم میں ہے۔ ویسٹ انڈیز بُحیرۂ کریبین کے جزیرے ہیں۔

شمالی امریکا کے جنوبی حصّے کو وسطی (بیچ کا) امریکا کہتے ہیں۔ یہ علاقہ گردن کی طرح ہے اور شمالی امریکا اور جنوبی امریکا کے برّاعظموں کو آپس میں ملاتا ہے۔

پہاڑ اور میدان : برّاعظم شمالی امریکا کے بعض لمبے چوڑے علاقے ابھی تک ویران پڑے ہیں۔ یہاں اُونچے اُونچے پہاڑی سِلسِلے اور بڑے بڑے میدان ہیں۔

اِس برّاعظم کے شمال مغرب میں الاسکا سے لے کر جنوب میں وسطی امریکا تک 6000 کلومیٹر لمبے پہاڑی سلسلے ہیں، جنہیں ویسٹرن ماؤنٹنز یا مغربی پہاڑ کہتے ہیں۔ اِن میں سب سے بڑا پہاڑی سِلسِلہ راکیز (Rockies) کہلاتا ہے۔ اِس پہاڑی سلسلے کی 50 سے زیادہ برف پوش چوٹیاں 4,000 میٹر سے بھی زیادہ اُونچی ہیں۔

اِن پہاڑی سِلسِلوں میں جو جانور پائے جاتے ہیں، اُن میں بُھورے ریچھ، بَل مُوز اور پہاڑی بکرے قابلِ ذکر ہیں۔ گنجا عُقاب یہاں کا مشہور پرندہ ہے۔

راکیز کے مغرب میں، بحرالکاہل کے ساحل کے ساتھ ساتھ، کئی اور پہاڑی سلسلے ہیں۔ اِن کے اور راکیز کے درمیان ایک نشیبی علاقہ ہے، جس میں کئی مشہور مقامات ہیں۔ اِن میں سے ایک "گریٹ کین یَن" یا بڑی گھاٹی ہے۔ یہ گھاٹی 450 کلومیٹر لمبی اور بعض جگہ ایک کلومیٹر سے بھی زیادہ گہری ہے۔

بحرِاوقیانوس (اٹلانٹک) کے ساحل کے قریب جو پہاڑ ہیں، اُنہیں ساؤتھ ایسٹرن ماؤنٹنز (جنوب مشرقی پہاڑ) کہتے ہیں۔ اِس علاقے میں ریاست ہائے مُتحدہ امریکا کے غریب ترین لوگ رہتے ہیں۔

مغربی اور مشرقی پہاڑوں کے درمیان ایک لمبا چوڑا نشیبی علاقہ ہے، جسے انٹیریَر پلین (اندرونی میدان) کہتے ہیں۔ یہ علاقہ شمالی امریکا کا دِل ہے۔ یہاں دنیا کی بہترین زرعی زمینیں ہیں، جن میں گندم اور دوسری اجناس کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اُود بلاؤ، بھیڑیے اور سانپ اِس علاقے کے مشہور جانور ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں بائزن (جنگلی بھینسے) بھی لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے تھے، لیکن اندھا دُھند شکار کی وجہ سے اب اِن کی تعداد برائے نام رہ گئی ہے۔

انٹیریَر پلین یا اندرونی میدان کے شمال میں ایک اور نشیبی علاقہ ہے جسے کینیڈیَن شیلڈ کہتے ہیں۔ اِس میں آدھا کینیڈا اور ریاست ہائے مُتّحدہ امریکا کے بعض علاقے شامل ہیں۔ یہاں کی زمین زیادہ تر بنجر ہے، اور کھیتی باڑی کے لیے موزوں نہیں۔

جِھیلیں اور دریا : اِس برّاعظم میں شمال مغرب سے لے کر مشرق تک بڑی بڑی جھیلیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اِن میں کینیڈا اور ریاست ہائے متّحدہ امریکا کے درمیان پائے جانے والی وہ جھیلیں بھی شامل ہیں جنھیں "گریٹ لیکس" کہتے ہیں۔ اِن جھیلوں میں سے ایک جھیل، جو "لیک سُپیریَر" کہلاتی ہے، دنیا کی میٹھے پانی کی سب سے بڑی جھیل ہے۔

برّاعظم شمالی امریکا میں بڑے بڑے دریا بہتے ہیں، جن میں شمال میں بہنے والا دریا میکنزی، شمال مشرق میں بہنے والا دریا سینٹ لارنس اور جنوب مشرق میں بہنے والا دریا مِسی سی پی قابلِ ذکر ہیں۔

آب و ہوا : اِس برّاعظم کا شمالی حصّہ بہُت سرد اور برفیلا ہے۔ یہاں کہیں کہیں سدا بہار درخت اُگتے ہیں۔ وسطی حصّہ گرمیوں میں بہُت گرم اور سردیوں میں بہُت گرم ہوتا ہے۔ جنوبی حصّہ عام طور پر سارا سال گرم رہتا ہے۔

باشندے : ریاست ہائے مُتّحدہ امریکا اور کینیڈا کے لوگ بہُت خوش حال ہیں۔ شاید ہی کوئی گھرانا ایسا ہو جس کے پاس اچّھا گھر، موٹر کار، ٹیلی وژن سیٹ، واشنگ مشین اور فرِج وغیرہ نہ ہو۔ البتّہ برّاعظم کے جنوب میں حالات مختلف ہیں۔ میکسیکو، وسطی امریکا اور جزائرِ کیریبین کے اکثر لوگ بہُت غریب ہیں۔

برّاعظم شمالی امریکا کی کُل آبادی 36 کروڑ سے زائد ہے۔ اکثر لوگ بڑے بڑے شہروں میں رہتے ہیں۔

ریڈ انڈین اِس برّاعظم کے قدیم باشندے ہیں۔ اِن کے باپ دادا ایشیا سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ اِنھوں نے یہاں دو عظیم تہذیبوں (ایزٹک اور مایَن) کی بُنیاد رکھی۔ ایزٹِک تہذیب اُس علاقے میں پھلی پُھولی جہاں اب میکسیکو

شمالی امریکا کے ریڈ انڈین

کا ملک آباد ہے، اور مایَن تہذیب میکسیکو اور وسطی امریکا کے بعض علاقوں میں پروان چڑھی۔ شمالی علاقوں میں ریڈ انڈین لوگ بڑے بڑے قبیلوں کی شکل میں رہتے تھے۔ اِن قبیلوں نے یورپی حملہ آوروں کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آج کل ریاست ہائے متحدہ امریکا اور کینیڈا میں ریڈ انڈین صِرف اُن علاقوں میں رہتے ہیں جو اِن ملکوں کی حکومتوں نے اُن کے لیے مخصوص کر دیے ہیں۔

کینیڈا اور گرین لینڈ کے اِنتہائی شمال میں اِسکیمو رہتے ہیں۔ اِن کے باپ دادا بھی ایشیا ہی سے یہاں آئے تھے۔

یورپ کے لوگ شمالی امریکا میں سولھویں صدی میں آنا شروع ہوئے۔ اُنھوں نے ریڈ اِنڈینوں سے وہ تمام علاقے چھین لیے جہاں کھیتی باڑی کے لیے اچھی زمینیں تھیں یا جہاں لوہا، کوئلا اور پٹرولیم جیسی معدنیات پائی جاتی تھیں۔ یورپ کے اِن حملہ آوروں نے یہاں بڑے بڑے زرعی فارم بنائے، خوب صورت اور صاف ستھرے دیہات اور شہر بسائے، جگہ جگہ کارخانے لگائے اور اپنی محنت و ذہانت سے شمالی امریکا کو دُنیا کا سب سے دولت مند برّاعظم بنا دیا۔

جب یورپ کے لوگ شمالی امریکا میں آئے اور اُنھوں نے یہاں کھیتی باڑی شروع کی تو اُنھیں کھیتوں میں کام کرنے کے لیے ایسے آدمیوں کی ضرورت پڑی جو کم سے کم پیسوں میں زیادہ سے زیادہ کام کریں۔ چُناں چہ بہُت سے یورپی لوگ افریقہ سے ہزاروں افریقی جوانوں کو پکڑ کر لے آئے اور اُنھیں یورپی زمینداروں کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ افریقی غُلام اُن کے کھیتوں میں صبح سے شام تک

کام کرتے تھے اور اُنھیں کھانے کے لیے رُوکھی سُوکھی روٹی اور پہننے کے لیے موٹا جھوٹا کپڑا دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی اِحتجاج کرتا تو اُسے گولی مار دی جاتی۔ آخر جنوری 1863ء میں ریاست ہائے مُتحدہ امریکا کے سولھویں صدر ابراہام لِنکن نے اِنھیں غُلامی سے چھُٹکارا دِلوایا اور یہ لوگ آزاد کر دیے گئے۔

زبان : ریاست ہائے مُتحدہ امریکا اور کینیڈا کے اکثر لوگ انگریزی زبان بولتے ہیں۔ کینیڈا کے بعض حِصّوں میں فرانسیسی زبان بولی جاتی ہے، کیوں کہ یہاں سب سے پہلے فرانس کے لوگ آکر آباد ہوئے تھے۔ میکسیکو، وسطی امریکا اور جزائرِ کیریبیَن کے اکثر لوگ ہسپانوی (اِسپینش) زبان بولتے ہیں، کیوں کہ اِن علاقوں پر اِسپین کی حکومت رہی ہے۔

زراعت : ریاست ہائے مُتحدہ امریکا اور کینیڈا کی زمین بہُت زرخیز ہے۔ یہاں بڑے بڑے زرعی فارم ہیں جن میں جدید ترین مشینوں سے کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔ زمیندار اپنے کھیتوں میں گندم، پھل اور سبزیاں اُگاتے ہیں۔ البتّہ میکسیکو اور جنوب کے دوسرے ملکوں میں کھیتی باڑی زیادہ تر پُرانے طریقوں سے کی جاتی ہے۔

صنعتیں : برّاعظم شمالی امریکا قیمتی معدنیات سے مالا مال ہے۔ یہاں پٹرولیم، لوہا، کوئلا، سیسہ اور تانبہ اِفراط سے پایا جاتا ہے۔ ریاست ہائے مُتحدہ امریکا کے کارخانوں میں ضرورت کی تمام اشیا تیّار کی جاتی ہیں، اور اِن کا معیار بہُت اُونچا ہوتا ہے۔

تاریخ : برّاعظم شمالی امریکا میں سب سے پہلے یورپ کے ایک ملک اِسپین کے لوگ آئے۔ اُس وقت یہاں ریڈ انڈینوں کی دو سلطنتیں (ایزٹک اور مایَن) قائم تھیں۔ اِن گورے حملہ آوروں نے اِن دونوں سلطنتوں کو تباہ کر دیا اور یہاں اپنی بستیاں بسائیں۔ اِس کے بعد شمالی علاقوں میں فرانس اور انگلینڈ کے لوگ آ آکر بسنے لگے۔ انگریزوں نے یہاں اپنی جو کالونیاں بنائیں، اُن پر انگلینڈ کا بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ 1776ء میں انگریزوں کی 13 کالونیوں نے لڑ بھڑ کر انگلینڈ کی فوج کو نکال دیا، اور ایک آزاد ملک کی بُنیاد رکھی جس کا نام ریاست ہائے مُتحدہ امریکا رکھا گیا۔ اِس نئے ملک کا پہلا صدر جارج واشنگٹن تھا۔

شریف آدمی؟

محمد یونُس حسرت

لالی انسپکٹر احمد کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

"میں اِیمان سے کہتا ہوں' جناب۔ میں تو اُس جگہ کے آس پاس بھی نہیں تھا۔ میری بیوی زینب بھی میری اِس بات کی گواہی دے سکتی ہے۔ وہ لالی کبھی کا مرچکا ہے جو چوری کی وارداتیں کیا کرتا تھا۔ آپ کے سامنے جو لالی کھڑا ہے' اِس کا چوری سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ شریف آدمی ہے اور محنت کر کے حق حلال کی روٹی کھاتا ہے"۔

اِتنا کہہ کر لالی نے اِنسپکٹر احمد کی طرف دیکھا اور کہا "کیا آپ کو میری بات کا یقین نہیں' اِنسپکٹر صاحب؟ آپ تو میرے حالات اچھی طرح جانتے ہیں"۔

"ہاں" اِنسپکٹر احمد کہنے لگے "میں جانتا ہوں کہ تم نے ایک شریف خاتون سے شادی کی ہے اور اُس نے تمہاری باگیں کس کر تمہیں بھی شرافت کے دائرے میں رکھا ہوا ہے۔ اگر مجھے تمہاری بات کا یقین نہ ہوتا تو تمہیں یہ ضرور بتاتا کہ اِتحاد سُپر اِسٹور والوں کے سیف سے جس طرح 5 لاکھ روپے کی رقم اُڑائی گئی ہے' وہ کسی ایسے ویسے اناڑی چور کا کام نہیں"۔

"تو پھر مجھے اِجازت دیجیے" لالی نے کہا۔

"ٹھہرو' لالی" اِنسپکٹر احمد نے اُسے رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ سیف (تجوری) اسٹینڈرڈ سیف کمپنی والوں کا سات نمبر والا سیف تھا۔ سات نمبر والا سیف سمجھتے ہو ناں؟"

"جی ہاں" لالی نے جواب دیا۔

"تو تمہارے خیال میں چوروں نے اُسے کیسے توڑا ہوگا؟"

"ہوں" لالی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے' اُنہوں نے اُسے گیس سے کاٹا ہوگا یا پھر ڈرِل سے۔ لیکن یہ آپ کیا کہلوانا چاہ رہے ہیں مُجھ سے؟ میں تو اب کسی کا ایک تِنکا توڑنے کا بھی روادار نہیں۔ میں تو اَب سولہ آنے شریف آدمی ہُوں"۔

"اچھا بھئی' اچھا" اِنسپکٹر احمد نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم نے تو تمہیں اِس لیے بُلوایا تھا کہ شاید تمہارا پُرانا تجربہ ہمارے کچھ کام آسکے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں یہ مُہم تمہاری مدد کے بغیر ہی سر کرنی پڑے گی"۔

"ایک شریف شہری کی حیثیت سے میں آپ سے ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ویسے بھی آپ جانتے ہی ہیں کہ جُرم کبھی چھپا نہیں رہ سکتا"۔

اُسی شام جب لالی گھر پہنچا تو اُس کی بیوی زینب اپنا

چہرہ دونوں ہاتھوں سے چُھپائے رو رہی تھی۔ لالی نے حیران ہو کر کہا "یہ تم رو کیوں رہی ہو، زینب؟ کیا بات ہے؟"

"یہ پُوچھو، کیا بات نہیں ہُوئی؟" زینب نے تلخی سے کہا۔

"چلو، وہی بتا دو"۔ لالی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تمہیں مذاق سُوجھ رہا ہے" زینب نے غصّے سے کہا "پتا نہیں تم کہاں جا کے مر گئے تھے۔ تمہارے پیچھے دو آدمی آئے تھے، اور وہ تمہارا پُوچھ رہے تھے"۔

"دو آدمی؟" لالی کے کان کھڑے ہو گئے "کون تھے وہ، اور کیوں آئے تھے؟"

"اُن میں سے ایک نے تو اپنا نام قادرا بتایا تھا......"۔

"قادرا؟" لالی نے ٹوک کر کہا "اُونچا لمبا قد، بھاری بھرکم جسم اور دائیں گال پر زخم کا نشان۔ ہے ناں؟"

"ہاں" زینب بولی "اور دوسرے کا نام سِراج تھا"۔

"سِراج" لالی نے حیرت سے کہا "تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قید سے چھوٹ کر آگیا ہے۔ مُعافی مِل گئی ہوگی۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ یہاں کیوں آئے تھے اور کیا چاہتے تھے؟"

"پتا نہیں کیا چاہتے تھے" زینب نے جواب دیا "اُنھوں نے کہا تھا کہ جب لالی آئے تو اُس سے کہنا کہ اگر تم اپنی بیوی کو صحیح سلامت اور جیتا جاگتا دیکھنا پسند کرتے ہو تو آج رات گیارہ بجے نیشنل پارک کے شِمالی دروازے کے پاس ہمیں مِلنا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میرا شوہر پچھلے چار سال سے ایک شریف شہری کی زندگی بسر کر رہا ہے تو وہ قہقہے لگانے لگے"۔

"اُنھوں نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟"

"نہیں" لیکن میں اُنہیں دیکھ کر ڈر ضرور گئی تھی۔ اِسی لیے اُن کے جانے کے بعد میری آنکھوں میں آنسو آگئے"۔

"قُدرتی بات ہے" لالی نے کہا "لیکن تم فکر نہ کرو۔ ہم اِن لوگوں سے نپٹنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچ لیں گے"۔

"تو کیا تم پولیس کو خبر کرو گے؟"

"میں وہیں سے آ رہا ہوں" لالی نے جواب دیا اور پھر اُس کو ساری بات بتا دی۔ پھر وہ کہنے لگا "میرا خیال ہے، اگر میں اِنسپکٹر احمد کو جاکر یہ بات بتادوں تو وہ چند سپاہی ہماری حفاظت کے لیے بھیج دیں گے۔ مگر اِس سے بات ختم نہیں ہوگی۔ میں اِن لوگوں کو اچھّی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے خیال میں وہ کیا چاہتے تھے؟"

"میں تو اندازہ ہی لگا سکتی ہوں"۔

"ہاں، میں بھی اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔ وہ مُجھ سے اپنے لیے چند وارداتیں کرانا چاہتے ہیں، شاید۔ اُنھوں نے اِسٹینڈرڈ کمپنی کے سیف نمبر سات کو ضرور توڑ لیا ہے۔ مگر اِتنے ہوشیار اور چالاک نہیں ہیں کہ آٹھ نمبر کے سیف کو بھی توڑ سکیں۔ پتا نہیں ہمارے اِس لاکھوں کے شہر میں آٹھ نمبر کے سیف کتنے ہوں گے"۔

"تو اب تم کیا کرو گے؟"

لالی نے ایک آہ بھری اور پھر کہنے لگا "اِسے مُجھ تک ہی رہنے دو، لیکن تم مُطمئِن اور بے فکر رہو"۔

رات کے گیارہ بجنے کو تھے جب لالی نیشنل پارک کے شِمالی دروازے کے پاس پہنچا۔ سامنے سے ایک لمبی سی موٹر کار آئی اور لالی کے پاس آکر رُک گئی۔ کار کا دروازہ ذرا کُھلا اور ساتھ ہی اندر سے آواز آئی۔ "لالی؟"

"ہاں"۔

کار کا دروازہ پُورا کُھل گیا۔

"اندر آجاؤ، لالی۔ تم ہمارے پُرانے وقتوں کے ساتھی ہو۔ ہم تمہارے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ پُرانی باتیں، کچھ نئی باتیں"۔

وہ اُن دونوں کے درمیان جا بیٹھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اُنھوں نے اُسے اپنے درمیان بٹھا لیا۔ اُس کے ایک طرف اُونچے لمبے قد اور بھاری بھرکم جسم والا قادرا تھا جس کے چہرے پر زخم کا نشان تھا اور دوسری طرف ٹیڑھی ناک والا سِراج۔

"تم نے کیا کہا تھا میری بیوی سے؟ میں گھر گیا تو وہ بُری طرح ڈری ہوئی تھی اور زار زار رو رہی تھی"۔ لالی نے کہا۔

"ہم نے تو اُسے کچھ نہیں کہا" سراج معصوم سا چہرہ بنا کر بولا "اِیمان سے، ہم نے تو صِرف اِتنا کہا تھا کہ ہم لالی سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میرے ہاتھ میں جو کُھلا ہوا چاقو تھا، اُس کے چمکتے ہوئے پھل پر اُس کی نظر پڑ گئی ہو اور وہ ڈر گئی ہو"۔

"تم......"۔

مگر لالی کی بات اُس کے ہونٹوں پر ادھوری ہی رہ گئی۔ بھاری بھرکم قادرے نے اُس کی کلائی پکڑ کر اِتنے زور سے دبائی کہ اُس کے ہونٹوں سے آہ نکل گئی۔ اِس کے ساتھ ہی قادرے کی آواز آئی "آرام سے لالی، آرام سے!"

قادرے نے بڑے نرم لہجے میں کہا "لالی، ہم تو تم سے تھوڑا سا مشورہ اور تھوڑی سی مدد چاہتے ہیں۔ اِس کے بعد تم اور تمہاری بیوی دونوں چین کی نیند سو سکتے ہو اور صحیح سلامت بھی رہ سکتے ہو"۔

"اچّھا، تو کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ لیکن اگر تم نے میری بیوی کو پھر پریشان کیا تو یاد رکھو، مُجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا"۔

"پھر بگڑنے لگے" قادرے نے مُلائم سی آواز میں کہا "ہم تو ایک مکھّی تک کو پریشان کرنے کے حق میں نہیں۔ کیوں سِراج؟"

"بے شک' بے شک" ٹیڑھی ناک والے سراج نے تائید کرتے ہوئے کہا "ہاں' وہ مکھی خود ہمارے راستے میں آ جائے تو اور بات ہے"۔

"لالی کو ساری بات بتا دو" قادرے نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔

"بات یہ ہے' میرے دوست" سراج نے کہا "ہم ذرا اُس سیف کے اندر جھانکنا چاہتے ہیں جو شان بینک کے صدر دفتر میں ہے اور اِس کے لیے ہمیں تمہاری مدد درکار ہے"۔

"وہ کس قسم کا سیف ہے؟" لالی نے پوچھا۔

"اِسٹینڈرڈ کا آٹھ نمبر" قادرے نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے ہم اِسٹیٹ بینک ہی پر ہاتھ کیوں نہ ڈالیں؟" لالی نے طنز سے کہا "ایک ہی دفعہ وارے نیارے ہو جائیں گے۔ہماری سات پُشتیں بیٹھ کر آرام سے کھائیں گی"۔

"نہیں" سراج نے بگڑ کر کہا "ہم ہم ہیں اور تم تم ہو--- جب ہم تم کہتے ہیں تو اِس سے مراد تم ہو' ہم نہیں۔ سارے اوزار ہمارے پاس ہیں۔ اندر داخل ہونے کا بندوبست ہم کریں گے۔ تمہیں صرف سیف کو کھولنا یا توڑنا ہو گا"۔

"جب سارے اوزار تمہارے پاس ہیں تو تم یہ کام خود ہی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"نہیں' ہم تمہاری مہارت سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ چوں کہ اب تمہارا اُٹھنا بیٹھنا شریف لوگوں میں ہے' اِس لیے تمہاری طرف کسی کا دِھیان نہیں جائے گا"۔

"میں اِس پر غور کروں گا" لالی نے کہا۔

اُس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ اُسے جُرم کی زندگی دوبارہ شروع کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ جِن اندھیروں کو اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا' دوبارہ اُن اندھیروں میں داخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر وہ ان دونوں آدمیوں کو اچھی طرح جانتا تھا اور جرائم کی تاریک دنیا کے جن لوگوں سے ان کے رابطے اور تعلقات تھے' اُن سے بھی واقِف تھا۔ اِن دونوں کا کہا نہ ماننے کی صورت میں وہ سارے لوگ شکاری کُتوں کی طرح اُس کے اور اُس کی بیوی کے پیچھے لگ سکتے تھے۔

قادرے نے اپنی جیب سے بڑے سے پھل والا چاقو نکالا اور اُسے لالی کے سامنے لہراتے ہوئے بولا "تم اِس پر ابھی غور کرو اور ابھی اپنے جواب سے ہمیں آگاہ کرو۔ ہمیں بہرحال اُس سیف کے مال پر ہاتھ صاف کرنا ہے"۔

"اور ساتھ ہی اِتحاد سُپر اِسٹور والوں کے 5 لاکھ پر بھی" لالی نے طنز سے پوچھا۔

"اپنے مُنہ کو لگام دو' لالی!" قادرے نے چاقو لہراتے ہوئے کہا "تم سُن چکے ہو کہ ہمیں کیا چاہیے۔ تم یہ کام ہمارے ساتھ اور ہمارے لیے کرو گے۔ ہم سارا منصوبہ بنا چکے ہیں"۔

"کب کرنا ہے یہ کام؟" لالی نے پوچھا۔

"اگلی جُمعرات کو"۔

"یہ نہیں ہو سکے گا" لالی نے فیصلہ کُن انداز سے کہا۔

"کیوں؟"

"اِس لیے کہ جُمعرات کو تو مجھے اپنی بیوی کو اُس کے میکے لے کے جانا ہے۔ اُس کے بھائی کی منگنی ہے"۔

قادرے نے سراج کی طرف اور سراج نے قادرے کی طرف دیکھا' جیسے دونوں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ اب کیا کیا جائے؟

"تمہارے سالے کی منگنی کو بھی اِسی روز ہونا تھا" قادرے نے تلخی سے کہا۔ پھر سراج کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے کچھ طے کر کے بولا "ٹھیک ہے' ہم جُمعرات کی بجائے جُمعے کی رات رکھ لیتے ہیں۔ اور دیکھو! ذرا دیکھ بھال کے کوئی قدم اُٹھانا۔ جُمعے کی رات کے بعد ہم تمہارے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے"۔

اور لالی اپنے جی میں کہنے لگا' "کوئی بات نہیں۔ میں خود بھی جُمعے کی رات کے بعد تمہارے ساتھ کوئی واسطہ

رکھنا پسند نہیں کروں گا۔"

سارا کام لالی کے اپنے منصوبے کے مُطابق ہوا تھا۔ وہ جمعرات کو دن ہی میں اپنی بیوی کو اُس کے میکے چھوڑ آیا تھا اور خود ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے وہاں سے واپس چلا آیا تھا۔ زینب اُس کے واپس جانے سے خوش تو نہیں تھی مگر اُسے کوئی پریشانی بھی نہیں تھی۔ اُس نے لالی سے یہ پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ ایسا کیا کام ہے جو اپنی بیوی کے بھائی کی منگنی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اِدھر لالی کو بھی اِطمینان تھا کہ قادرا اور سراج بیوی کے میکے جاکر اُسے پریشان نہیں کر سکیں گے۔ پھر وہ وعدے کے مُطابق جُمعے کی شام کو سراج اور قادرے کے پاس پہنچ گیا تھا۔

شان بینک تک پہنچنے میں اُنہیں پچیس تیس منٹ لگے۔ وہ ایک پچھلی گلی کی طرف سے دیوار میں نقب لگا کے عمارت میں داخل ہوئے۔ بینک کا الارم سسٹم سراج اور قادرے نے جمعرات کی شام ہی کو ناکارہ کر دیا تھا۔ اُنھوں نے سیف تک پہنچ کر کھڑکیوں کے شیشوں کو ڈھانپا اور پھر سیف کو توڑنے کے کٹھن کام میں جُت گئے۔

لالی دل ہی دل میں اُن کی دانائی اور ہوشیاری کی تعریف کر رہا تھا۔ قادرے اور سراج نے اپنے کام میں کسی چھوٹی سی چھوٹی بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا۔ گیس کٹر اور ڈرلر دونوں بہترین قسم کے تھے اور وہ اِحتیاط کے طور پر گیس کا ایک زائد سلنڈر بھی ساتھ لے آئے تھے۔ مگر اِس ساز و سامان کے اِستعمال میں بڑی مہارت اور دانش مندی درکار تھی۔ نامُناسب حرارت کے اِستعمال کی صورت میں تالے کُھلنے کی بجائے سیف کے ساتھ چپک کر اُسے اور بند کر سکتے تھے۔ اِسی خیال کے تحت اُنھوں نے نل کی ٹُونٹی کے ساتھ ربڑ کی نالی لگا لی تھی اور نالی کا دوسرا سِرا سیف تک لے آئے تھے تاکہ ضرورت پڑے تو اُس سے کام لیا جا سکے۔ لالی آنکھوں پر ویلڈروں والا چشمہ چڑھائے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ لوہے کو گیس کٹر سے کاٹتے ہوئے لوہے کے ریزے اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ آخر کار خاصی دیر بعد اُس نے گیس کٹر کو ایک طرف کیا، آنکھوں سے چشمہ اُتارا اور پھر کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے، اب دیکھ لینا چاہیئے کہ یہ ٹُوٹا ہے کہ نہیں؟"

"ابھی سے؟"

"میرا خیال ہے، تُڑائی کرلینے میں کوئی ہرج نہیں۔ کُھل جائے تو ٹھیک ورنہ تھوڑا سا کام اور کرلیں گے--- ویسے مجھے تو کام یابی کا پورا یقین ہے"۔

"اور شور کا کیا کریں گے؟"

"ہم اُسے دبا سکتے ہیں۔ دیکھو، اب یہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ تم ذرا اِدھر اُدھر دیکھو اور فرش سے جتنی چٹائیاں ملیں، سمیٹ لاؤ"۔

لالی کے کہنے کے مُطابق قادرے اور سراج نے فرش سے قالین اور چٹائیاں جمع کر کے سیف کے اِردگِرد لا ڈالیں۔ جتنی دیر میں وہ قالین اور چٹائیاں جمع کر کے لائے، اِتنی دیر میں لالی نے آتش گیر مادّہ سیف کے اُس سوراخ میں ٹھونس دیا جو اُس نے گیس کٹر کی مدد سے کیا تھا۔ اُن کے واپس آنے سے پہلے پہلے وہ چھوٹی سی بیٹری کو آتش گیر مادّے کے ساتھ سیٹ کر کے اُس کا ڈیٹونیٹر یعنی برقی فلیتہ ہاتھ میں لے کر پوری طرح تیّار ہو چکا تھا۔ وہ جی میں سوچ رہا تھا کہ کام اُس کی مرضی کے مُطابق ہوگیا تو ہوگیا ورنہ--- ورنہ---- زینب بیوہ ہو جائے گی---- یا پھر کچھ بھی ہو سکتا تھا!

لالی کی ہدایت کے مُطابق قادرے اور سراج نے قالین اور چٹائیوں سے سیف کو اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ پھر لالی نے اُن سے کہا "اب تم سامنے اُس کونے میں چلے جاؤ"۔

"وہاں؟" قادرے نے کہا "وہاں تو سیف کا دروازہ عین ہمارے سامنے ہوگا"۔

"تم اُس کونے میں چلے جاؤ" لالی نے دوبارہ کہا "تمہارے لیے وہی جگہ مُناسب ہے۔ تمہیں شاید میری بات

کا یقین نہیں آ رہا۔ میں تمہیں یقین دلانے کی خاطر اِس سیف کے اُوپر بیٹھ جاتا ہوں۔ ٹھیک ہے؟"

"مگر دھماکا؟"

"وہ اندر کی طرف ہوگا" لالی نے چڑ کر کہا "اگر تم اِس کام کے بارے میں سب کچھ پہلے ہی جانتے تھے تو پھر مجھے کیوں لائے تھے؟"

"ٹھیک ہے" قادرے نے کہا اور وہ دونوں اُس کونے میں جا کھڑے ہوئے جس کی طرف لالی نے اِشارہ کیا تھا۔

لالی ڈیٹونیٹر کا تار ہاتھ میں تھام کر سیف کے اُوپر بیٹھ گیا۔ اُس نے ریڈی کہ کر ذرا سا وقفہ دیا پھر تار ساتھ ملا کر سرکٹ مکمل کیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

دھم کی ایک بھدّی سی آواز آئی اور لالی کو جھٹکا لگا۔ اُس کی ریڑھ کی ہڈّی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ چھلانگ لگا کر سیف سے نیچے کُود گیا اور سامنے کی طرف دیکھا۔

سب کچھ ویسے ہی ہُوا تھا جیسے اُس نے سوچا تھا۔ سیف کا دروازہ دھماکے سے الگ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا۔ سامنے کونے کی طرف سے آنے والی کراہوں نے بتا دیا تھا کہ سیف کا دروازہ ٹوٹ کر قادرے اور سراج کو جا لگا ہے۔ اُس نے مزید کچھ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، دروازہ بند کیا اور پھر اِنسپکٹر احمد کو فون کرنے لگا۔

"قادرے کا بازو ٹوٹ گیا ہے' سراج کی چار پسلیاں ٹیڑھی ہوگئی ہیں اور اُس کے چہرے پر کئی زخم آئے ہیں" اِنسپکٹر احمد نے کہا "ٹھیک ہے' اُنہوں نے تمہاری بیوی کو دھمکیاں دی تھیں اور تم نے اُن سے اِنتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب تم نے سیف کو کھولا تو وہ خالی تھا۔ اُس میں

کوئی رقم نہیں تھی۔ یہ تمہارا بیان ہے، لالی۔ بھلا کون اِس بیان پر یقین کرے گا؟"

"کیوں نہیں کرے گا، جناب؟" لالی نے سادگی سے پوچھا "کیا میں نے خود فون کر کے آپ کو بتایا نہیں تھا؟"

"یقیناً بتایا تھا" اِنسپکٹر احمد بولے "مگر یہ بھی تو عین ممکن ہے کہ تم نے سیف سے ساری رقم پار کر کے کہیں چُھپانے کے بعد پھر ہمیں فون کیا ہو"۔

"جناب" لالی نے کہا "کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں آرہا کہ میں ایک شریف آدمی ہوں؟"

"شاید میں یقین کر ہی لُوں" اِنسپکٹر احمد نے کہا "مگر سوال اُس رقم کا ہے جو اُس سیف میں تھی، اور وہ ہمیں ملنی چاہیئے۔ بہرحال، اِس معاملے میں تم پر شُبہ کیا جا سکتا ہے، چاہے تم ہزار قسمیں اور حلف اُٹھا اُٹھا کر یہ کہو کہ تم اِس کام سے توبہ کر چکے ہو اور چوری ڈاکے سے اب تمہارا کوئی واسطہ نہیں"۔

"میں نے یہی بات ذہن میں رکھتے ہوئے اِحتیاط سے کام لیا تھا، جناب" لالی نے کہا "کیا میں یہ توقّع رکھوں کہ یہ بات صِرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گی؟"

"کون سی بات؟" اِنسپکٹر احمد نے پوچھا۔

"وہ بات یہ ہے کہ جمعرات کی شام کو آپ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اگر آپ گھر جاکر ایک نظر اپنے سیف میں جھانکنے کی زحمت کریں تو آپ کو شان بینک کے سیف کی تمام کی تمام رقم وہاں ملے گی۔ میں اُسے جمعرات کی رات ہی وہاں سے اُڑا کر آپ کے ہاں رکھ آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہی ایک جگہ ایسی ہے جہاں وہ محفوظ رہے گی"۔

اِنسپکٹر احمد نے عجیب سی نظروں سے لالی کی طرف دیکھا۔ "تمہارا مطلب ہے، تم نے جمعرات کی شام کو وہ رقم وہاں سے چُرائی اور سیف کے دروازے کو اِس طرح سیٹ کیا کہ وہ کھُل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ پھر تم نے میرے گھر میں نقب لگائی اور لُوٹ کا مال وہاں رکھ دیا۔ تمہیں یہ جُرائت ہوئی کیسے؟ اب میں لوگوں کو اِس بارے میں کیا ـــ بتاؤں گا؟"

"جو جی میں آئے بتائیں، جناب" لالی نے اِطمینان سے کہا "لیکن اگر آپ خاموشی اِختیار فرمائیں تو مُجھ شریف آدمی کے لیے خیریّت ہی خیریّت ہے"۔

اِنسپکٹر احمد کچھ کہنا چاہتے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اُنہوں نے ریسیور اُٹھایا۔ بیگم کا فون تھا۔

"بیگم؟ ہاں بیگم! وہ، وہ رقم میرے ایک دوست کی ہے جو اُس نے حفاظت کے خیال سے میرے پاس رکھوائی تھی۔ اوہ! ہاں۔ مجھے خیال نہیں رہا تمہیں بتانے کا۔ کوئی بات نہیں۔ صرف اِتنا کرو کہ سیف کو تالا لگا دو اور اُس کی چابی ذرا اِحتیاط سے رکھنا۔ اوہ! ہاں۔ فکر نہ کرو۔ میں پانچ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ خدا حافظ!"

"میرا خیال ہے کہ وہ رقم بیگم صاحبہ نے گِنی نہیں ہوگی"۔

"دفع ہو جاؤ، یہاں سے!" اِنسپکٹر احمد نے لالی کے مذاق کا بُرا مانتے ہوئے کہا "ورنہ میں تمہیں ابھی اندر کرا دوں گا"۔

"جاتا ہوں، جناب" لالی نے حُکم کی تعمیل کرتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"ٹھہرو!" اِنسپکٹر احمد نے کہا اور لالی کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔

"فرمایئے، جناب؟" اُس نے بڑے ادب سے کہا۔

"تمہاری قادرے اور سراج سے اِنتقام لینے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ مگر یہ بتاؤ کہ تم نے شان بینک کے سیف کو کھول کر اُسے دوبارہ اِس حالت میں کیسے کر دیا کہ قادرے اور سراج کو یہ شک نہ ہو سکا کہ اُس سیف کو کسی نے کھولا ہے!"

"بڑی سیدھی سی بات ہے، جناب" لالی نے کہا "آپ کو شاید یہ خیال نہیں رہا کہ میں جس ورک شاپ میں کام کرتا ہوں وہ اِسٹینڈرڈ سیف والوں ہی کی ورکشاپ ہے"۔

محمد ادریس قریشی

اندھی ٹرین کا سفر

میری زندگی بہت سے دل چسپ اور عجیب و غریب واقعات سے بھری پڑی ہے۔ آج میں آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں جو تقریباً دو سال پہلے پیش آیا۔

ہُوا یوں کہ ڈاکیا گھر میں ایک لفافہ پھینک گیا۔ میں نے کھولا تو وہ ایک دعوتی کارڈ تھا۔ گوجرانوالہ میں ایک ادبی جلسہ ہو رہا تھا، جس میں شرکت کے لیے مجھے بُلایا گیا تھا۔ جلسے کی تاریخ تھی 15 اکتوبر۔ اِتفاق سے 14 اکتوبر کو مجھے لاہور جانا تھا۔ میں نے پروگرام بنایا کہ 14 تاریخ کو اپنے شہر منڈی بہاءُ الدّین سے سیدھا لاہور چلا جاؤں گا، اور وہاں سے 15 تاریخ کو گوجرانوالہ جا کر جلسے میں شرکت کروں گا۔

14 تاریخ کو میں بیگ اُٹھا کر صبح سویرے گھر سے نکلا اور ویگن میں بیٹھ کر دِن کے دس بجے لاہور پہنچ گیا۔ وہ دن لاہور میں ہی گزارا، اور اگلے دن کے بارہ بجے گوجرانوالہ روانہ ہوگیا، کیوں کہ جلسے کا وقت سہ پہر کے تین بجے تھا۔

دو بجے کے قریب میں گوجرانوالہ پہنچا اور سیدھا ایک حمّام میں جا گھسا اور نہا کر کپڑے بدلے۔ گوجرانوالہ کے اُردو بازار میں میرے ایک عزیز دوست کی دکان ہے۔ میں نے سوچا کہ بیگ اُس کی دکان میں رکھ دوں۔ جلسے سے واپسی پر لے لوں گا۔ تانگے میں بیٹھ کر دکان پر پہنچا تو دوست نے گرم جوشی سے اِستقبال کیا۔ بیگ وہاں رکھنے اور چائے پانی پینے کے بعد میں وہاں سے چل پڑا۔

تین بجنے والے تھے۔ جلسہ جی ٹی روڈ پر پاکستان نیشنل سینٹر میں ہونا تھا۔ میں نیشنل سنٹر گیا اور جلسے میں شرکت کی۔ آخر میں کھانے پینے کا دَور چلا۔ ابھی لوگ کھا پی ہی رہے تھے کہ میں وہاں سے کِھسک آیا۔ ہال سے باہر نکلا تو ہر طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ اب پتا چلا کہ رات کافی ہوگئی ہے۔ آسمان پر کالے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، اور بجلی چمک رہی تھی۔ ہوا بھی فر فر چل رہی تھی اور بارش کسی بھی لمحے ہو سکتی تھی۔ یہ دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ جلدی جلدی سڑک کے کنارے آ کھڑا ہوا کہ کوئی ویگن آئے تو اُس میں بیٹھوں۔ دور سے کسی گاڑی کی لائٹیں نظر آئیں، مگر قریب آنے پر پتا چلا کہ وہ تو کسی کی کار ہے۔ کافی دیر تک کوئی تانگا یا ویگن نہ آئی۔ اُوپر سے بارش تیز ہونے کا بھی خطرہ تھا۔ مجبوراً میں نے پیدل ہی چلنے کا فیصلہ کیا۔ میری رفتار بہت تیز ہے۔ جی ٹی روڈ پر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا اندرونِ شہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں میرے

دوست دکان بند کر کے نہ چلے گئے ہوں۔ تیز ہوا اور بارش نے بھی مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میں دعا مانگنے لگا "یا اللہ! میری دو دعائیں قبول فرما۔ کم از کم ایک گھنٹا بارش نہ برسا، اور جب تک میں اپنے دوست کی دکان پر نہ پہنچ جاؤں، وہ دکان بند کر کے نہ جائے"۔

خدا اپنے گناہ گار بندوں کی دعائیں بھی سُنتا ہے۔ بارش بھی بند ہوگئی اور ہوا کا زور بھی کم ہوگیا۔ میں جی ٹی ایس کے اڈّے پر پہنچا اور دائیں ہاتھ کے راستے پر مُڑ کر اُردو بازار کے راستے پر چل پڑا۔ بازار کی اکثر دکانیں بند تھیں، مگر میرے دوست کی دکان کُھلی تھی۔

رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ میں نے دکان سے اپنا بیگ لیا۔ اُس وقت مجھے کوئی بس یا ویگن نہیں مل سکتی تھی، اِس لیے میں نے ٹرین سے جانے کا فیصلہ کیا اور ریلوے اِسٹیشن پہنچ گیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ لالہ موسیٰ جانے والی گاڑی تو بارہ بجے آئے گی۔ لالہ موسیٰ سے منڈی بہاءُ الدّین کے لیے گاڑی بدلنی پڑتی ہے۔ لیکن اب مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ پلیٹ فارم پر کئی مسافر موجود تھے۔ اگرچہ میں کافی دیر پیدل چل چکا تھا، لیکن ایک جگہ ٹِک کر بیٹھنا میری عادت نہیں ہے۔ میں بیگ ہاتھ میں پکڑے پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر کاٹ رہا تھا۔ کبھی ٹہلتا ٹہلتا اِسٹیشن کی عمارت سے باہر آجاتا اور کبھی پھر اندر چلا جاتا۔ اِسی دوران میں دوسرے درجے کے مسافر خانے کے دائیں طرف بے خیالی میں چلا گیا۔ وہاں تھوڑا اندھیرا تھا۔ آگے جاکر مجھے ایک ناگوار سی بو محسوس ہوئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ وہاں ٹائلٹ بنے ہوئے ہیں۔ میں جلدی سے واپس مُڑا، اور مسافر خانے کے دروازے کی طرف جانے لگا۔ اُسی وقت ایک اندھیرے کونے میں سے ایک موٹا سا آدمی برآمد ہُوا اور بلند آواز سے بولا "کہاں چلے ہو، صاحِب جی؟ پیسے تو دیتے جاؤ"۔

میں نے حیران ہو کر اُس آدمی کو دیکھا اور بولا "کیا بات ہے؟"

موٹے نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور مکّاری سے بولا "لاؤ ایک روپیہ نکالو"۔

"ایک روپیہ؟ وہ کس خوشی میں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تم نے ٹائلٹ اِستعمال کیا ہے۔ ایک روپیہ نکالو،

جلدی" موٹے آدمی نے اِس بار غُصّے سے کہا۔ ایک روپے کی خاطر بحث کرنی فضول تھی۔ میں نے روپیہ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھا، جلدی سے وہاں سے کِھسکا اور پلیٹ فارم پر آکر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

جب گاڑی آنے کا وقت قریب ہُوا تو میں نے ٹکٹ خریدا، کیوں کہ اِس سے پہلے ٹکٹ گھر کی کھڑکی بند تھی۔ بارہ بجے گاڑی دھڑ دھڑاتی آگئی۔ اُس گاڑی کا نام تو اب مجھے یاد نہیں، یہ ضرور یاد ہے کہ اُس جیسی ریل گاڑی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انجن اور گارڈ کے ڈبّے کے سِوا باقی سب ڈبّوں میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ ایک دو مسافروں کے سِوا اور کوئی اُس گاڑی میں سوار نہ ہُوا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُس گاڑی کو لالہ موسیٰ جا کر ختم ہو جانا تھا۔ جب کہ اُن مسافروں کو آگے جانا تھا، اور دوسری گاڑی سوا بارہ بجے آنا تھی۔

گاڑی کی سِیٹیں اُکھڑی ہوئی، دروازے ٹوٹے ہوئے اور ہر چیز تباہ حال تھی۔ پلیٹ فارم پر لگے ہوئے بلبوں کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ کسی ڈبّے میں ایک مسافر بیٹھا ہے اور کسی میں دو۔ اکثر ڈبّے بالکل خالی پڑے تھے۔

میں ایک خالی ڈبّے میں چڑھ گیا، ایک سیٹ پر بیگ رکھا اور اُس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب گاڑی اِسٹیشن کی حد سے باہر نکلی تو ڈبّے میں رہی سہی روشنی بھی ختم ہو گئی۔ اب میں اِتنے گھُپ اندھیرے میں سفر کر رہا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ گاڑی کے باہر بھی گھٹا ٹوپ اندھیرا اور اندر بھی۔ ایسے میں گاڑی چلنے کے شور سے ایک پُراَسرار سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ پانچ دس مِنٹ گزر گئے۔ مجھے نیند آنے لگی۔ اچانک اُس تاریک ڈبّے میں ایک کھُردری سی آواز گونجی "ڈاہڈی تریہہ پئی لگّی اِے"۔ (بڑی سخت پیاس لگی ہے)۔

میں حیرت اور خوف سے اُچھل پڑا۔ اُس ڈبّے میں تو میرے سِوا کوئی اور مسافر نہ تھا۔ پھر یہ آواز کس کی تھی؟ جلد ہی وہ آواز پھر گونجی "اوئے! اِک گھُٹ پانی داتے پیا چھڈ ظالما۔ ڈاہڈی تریہہ پئی لگّی اِے"۔ (ایک گھونٹ پانی کا پلا دے، ظالم۔ بہُت سخت پیاس لگی ہے)۔

اب میں نے سوچا کہ کوئی مسافر اِس ڈبّے میں موجود ہے، جسے میں اندھیرے میں نہیں دیکھ سکا ہُوں گا۔ میں نے بھی اندھیرے میں آواز لگائی "کون ہے جسے اِتنی سردی میں پیاس لگ رہی ہے؟"۔

وہی آواز پھر آئی "میں..... میں مرنیں ایں پئی"۔ (میں مر رہی ہُوں)۔ تب مجھے محسوس ہُوا کہ یہ تو کوئی عورت ہے۔

اِتنے میں گاڑی کی رفتار ہلکی ہو گئی، اور پھر وہ ایک چھوٹے سے اِسٹیشن پر رُک گئی۔ یہ اِسٹیشن کسی گاؤں کا تھا، اِس لیے سُنسان پڑا تھا۔ وہاں صِرف ایک بلب جل رہا تھا جس کی ہلکی ہلکی روشنی گاڑی کے ڈبّے میں داخِل ہو رہی تھی۔ اب میں نے دیکھا کہ مُجھ سے دو تین سیٹوں کے فاصلے پر ایک بہُت موٹی عورت بیٹھی ہے۔ اُس نے اپنے گلے میں بڑے بڑے دانوں کی مالا ڈال رکھی تھی۔ سر کے بال کھُلے ہوئے تھے اور چہرہ بہُت خوف ناک لگ رہا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے کوئی جادوگرنی ہو۔ گاڑی کے رُکتے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھی اور نیچے اُتر گئی۔ سامنے پلیٹ فارم پر ایک نل لگا ہُوا تھا۔ وہ پڑ پڑ کر کے پانی پینے لگی، اور ڈھیر سارا پانی پی کر پھر ڈبّے میں آگئی۔

اُس اِسٹیشن سے نہ کوئی مسافر چڑھا، نہ اُترا۔ اُسی وقت ریلوے گارڈ ہمارے ڈبّے میں جھانک کر کہنے لگا "تم دونوں کسی ایسے ڈبّے میں چلے جاؤ جہاں دو چار مسافر بیٹھے ہوں۔ یہاں کوئی چور اُچکّا آسکتا ہے"۔

میں تو خاموش ہی رہا، عورت نے غصّے سے کہا "سن ایتھے کائی ناں کھاندا پیا"۔ (ہمارا یہاں کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا)۔

گارڈ نے کندھے اُچکائے اور سیٹی بجاتا ہُوا اپنے ڈبّے کی طرف چلا گیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ اب پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ چند ہی مِنٹ گزرے

ہوں گے کہ اُس عورت نے پھر آواز لگائی "ڈاہڈی تریہہ پئی لگّی اِے" (بڑی سخت پیاس لگی ہے)۔

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔ یہ عورت تھی یا کوئی بلا۔ سردی کے مارے میرے دانت بج رہے تھے، اور اُسے بار بار پیاس لگے جا رہی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہی فقرہ دوہراتی۔ میں اُسے پاگل سمجھ کر آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد گاڑی پھر ایک چھوٹے سے اِسٹیشن پر رُکی۔ وہ عورت پھر نیچے اُتری اور پلیٹ فارم پر لگے ہوئے نل سے مُنہ لگا کر غٹ غٹ پانی پینے لگی۔ جب تک گاڑی کھڑی رہی، وہ پانی پیتی رہی۔

اِس اِسٹیشن سے ایک لنگڑا مسافر بھی ہمارے ڈبّے میں آ چڑھا۔ اُس نے بغلوں میں بیساکھیاں دبا رکھی تھیں۔ وہ کھٹ کھٹ کرتا ہُوا آیا اور ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کے حرکت کرتے ہی وہ عورت بھی پانی کا پیچھا چھوڑ کر ڈبّے میں آ گئی۔ لنگڑا مسافر غور سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ اب اِس ڈبّے میں تین مسافر تھے۔ جب گاڑی چلی اور ہر طرف گھُپ اندھیرا ہو گیا تو لنگڑے نے اپنی بیساکھیاں ایک طرف رکھیں اور لنگڑاتا ہُوا میری طرف بڑھا۔ اُس نے اندھیرے میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، اور بولا "بابُو صاب، دو روپے تو دینا"۔

میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا اور بولا "پرے ہٹو"۔

بس پھر کیا تھا، اُس نے دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑ لی اور لگا زور زور سے بھینچنے۔ اُس کے ہاتھوں میں اِتنی طاقت تھی کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے تھے۔ ایسے میں پچھلی سیٹ سے اُس عورت کی آواز آئی "ڈاہڈی تریہہ پئی لگّی اِے"۔

ایسے وقت میں بھی مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اُس لنگڑے کے ہاتھوں کو پکڑ کر پیچھے ہٹایا اور گھُٹی گھُٹی آواز میں بولا "چھوڑو مجھے۔ میں تمہیں دو روپے دیتا ہوں"۔

اُس نے میری گردن چھوڑ دی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ نکالا۔ اندھیرے میں پتا نہ چلا کہ نوٹ دو کا ہے یا پانچ کا یا دس کا۔ بہرحال' میں نے جلدی سے وہ نوٹ اُس لنگڑے کو دے دیا اور وہ اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اُسی وقت پیچھے سے پیاسی جادوگرنی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ وہ غسل خانے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی' مگر دروازہ نہیں کُھل رہا تھا۔ وہ اُس پر لاتیں اور مُکّے برسانے لگی۔ ڈبّے میں دھڑام دھڑام کی آوازیں گونجنے لگیں۔

لنگڑے مسافر نے زور سے آواز لگائی "کیا بات ہے مائی؟"

عورت نے بھی چیخ کر جواب دیا "اوئے! ایدھا بوہا نئیں لتھدا پیا۔ ایدھے وِچ تے لگدا اے کائی بندا مُوا پیا جے"۔ (اِس کا دروازہ نہیں کُھل رہا۔ لگتا ہے اِس میں کوئی آدمی مرا پڑا ہے)۔

یہ کہ کر وہ پھر دروازے پر ٹکریں مارنے لگی۔ لنگڑے مسافر نے بیساکھیاں اُٹھائیں اور غسل خانے کی طرف چل پڑا۔ اب وہ دونوں اُس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے' مگر دروازہ نہیں کُھل رہا تھا۔ عورت ٹکریں مارنے کے ساتھ ساتھ چیخ بھی رہی تھی "یا تے کائی بندا مُوا پیا جے یا کائی جن بُھوت ایدھے وِچ وڑیا ہویا اِے"۔ (یا تو کوئی آدمی اِس میں مرا پڑا ہے یا کوئی جن بھوت گُھسا ہوا ہے)۔

میں اپنی سیٹ پر آرام سے بیٹھا اُس عورت اور لنگڑے کی حرکتیں دیکھتا رہا۔ وہ دونوں دروازے پر مُسلسل لاتیں برسا رہے تھے۔ اچانک دروازہ کُھل گیا اور اُس عورت کی آواز گونجی "اوئے ایدھے وچ تے کائی شے وی نئیں اِے"۔ (اِس میں تو کوئی چیز بھی نہیں ہے)۔

لنگڑے مسافر نے کہا "مائی' یہ دروازہ ویسے ہی جام ہوگیا تھا۔ گاڑی پُرانی ہے ناں"۔

عورت نے کہا "چنگا فیر۔ پراں ہٹ۔ مینوں پانی پی لین دے۔ ڈاہڈی تریہہ پئی لگی اِے"۔ (اچھا پھر پرے ہٹو۔ مجھے پانی پینے دو۔ بہت سخت پیاس لگی ہے)۔

مگر غسل خانے میں پانی نہیں تھا۔ عورت کی غصّے سے بھری آواز گونجی "ایدھے وِچ تے قطرک پانی وی ناں ہے۔ میں تریہہ نال مرنیں ایں پئی"۔ (اِس میں تو ایک قطرہ بھی پانی نہیں ہے۔ میں پیاس سے مر رہی ہوں)۔ یہ کہ کر وہ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی اور لنگڑا بھی اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔

گاڑی چلے جارہی تھی۔ دھڑم دھڑم' دھام دھام' چھکا چھکا' چھک چھک۔ اچانک اُس عورت نے بلند آواز سے عالم لوہار کا کوئی گانا گانا شروع کردیا۔ پانچ منٹ بعد جب اُس نے گانا بند کیا تو لنگڑا مسافر عطاءُ اللہ عیسیٰ خیلوی کی نقل اُتارنے لگا۔ آخر گُجرات کا اِسٹیشن آگیا۔ وہاں وہ عورت بھی اُتر گئی اور لنگڑا مسافر بھی۔ اِسٹیشن پر کافی روشنی تھی۔ وہ دونوں اِسٹیشن کے دروازے سے نکل کر باہر جارہے تھے۔ اِن عجیب و غریب مسافروں کی جُدائی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

بہرحال' جلد ہی گاڑی چل پڑی۔ مجھے تو لالہ موسیٰ اُترنا تھا۔ گجرات کے بعد ایک چھوٹا سا اِسٹیشن آیا' اور پھر لالہ موسیٰ آگیا۔ یہاں گاڑی سے اُترنے والا میں اکیلا مسافر تھا۔ دوسرے ڈبّوں میں جو ایک دو مسافر ہوں گے' وہ پہلے ہی کہیں اُتر گئے ہوں گے۔

گاڑی سے اُتر کر میں بیگ ہاتھ میں لیے پُل کی طرف بڑھا اور اُس پر چڑھ کر باہر آگیا' جہاں دوسرے درجے کا مسافر خانہ ہے۔ ٹکٹ گھر اور معلومات کی کھڑکی بھی یہیں ہے۔ اُس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ میں نے اِنکوائری سے پتا کیا تو معلوم ہُوا کہ سرگودھا جانے والی گاڑی اڑھائی بجے آرہی ہے۔ سرگودھا کے راستے میں منڈی بہاءُ الدّین آتی ہے۔ میں نے ٹکٹ لے کر جیب میں ڈال لیا۔ مسافر خانے میں تین چار آدمی بنچوں پر چادریں اوڑھے بیٹھے تھے۔ سردی خاصی ہوگئی تھی اور لالہ موسیٰ کی سردی تو ویسے بھی مشہور ہے۔

میں نے بیگ میں سے چادر نکالی اور اُسے اوڑھ کر

مسافر خانے کے باہر ٹہلنے لگا۔ چند منٹ بعد سوچا کہ پلیٹ فارم پر چل کر بیٹھنا چاہیے۔ یہ سوچ کر پُل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ یہ حصّہ سُنسان پڑا تھا اور یہاں زیادہ روشنی بھی نہیں تھی۔ میں چند سیڑھیاں ہی چڑھا ہُوں گا کہ سامنے سے تین آدمی آتے دکھائی دیے۔ قریب آتے ہی اُنھوں نے بازُو پھیلا کر میرا راستہ روک لیا۔ ایک آدمی نے کہا "جانے نہ پائے"۔

اُن تینوں کے چہرے خطرناک بدمعاشوں جیسے تھے۔ وہ مجھے پکڑنے کے لیے جھپٹے۔ ایسے وقت میں اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور بھاگنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی۔ میں ایک دم سیڑھیاں اُترا اور مسافر خانے کی طرف بھاگنے لگا۔ اُسی وقت ایک کار میرے سامنے آکر رُکی۔ اُس کی لائٹیں جلیں، اور اُس میں سے دو آدمی نیچے اُترے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کار بھی اُن بدمعاشوں کے ساتھیوں کی ہی ہے۔ میں نے گھوڑے کی طرح لمبی چھلانگ لگائی اور مسافر خانے کی طرف بھاگا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر دو تین مسافر کھڑے تھے۔ میں بھی جلدی سے اُن کے پیچھے کھڑا ہو گیا، حال آں کہ ٹکٹ میں پہلے ہی لے چکا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ کار اِسٹیشن سے نکل کر شہر کی طرف جا رہی تھی، لیکن مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ تینوں بدمعاش پُل کے پاس ہی نہ گھوم رہے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں مسافروں کی قطار سے ہٹ کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

اِتنے میں ایک تانگا مسافر خانے کے باہر آکر رُکا۔ اُس میں ایک پوری فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ لوگ نیچے اُترے۔ ایک آدمی نے ٹکٹ خریدے اور قلی کے سر پر سامان رکھ کر وہ لوگ پلیٹ فارم کی طرف چل پڑے۔ چند اور مسافر بھی پلیٹ فارم کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی اُن کے ساتھ ہو لیا۔ یہاں کوئی خطرہ نہ تھا۔ میں ایک ٹی اِسٹال سے چائے پینے لگا۔ اڑھائی بجے گاڑی آئی تو میں اُس میں سوار ہو گیا۔ اُس میں روشنی بھی تھی اور مسافر بھی بہُت سے تھے۔

پونے چار بجے گاڑی منڈی بہاءُ الدّین کے اِسٹیشن پر رُکی اور صبح کے چار بجے میں اپنے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

روٹی میں پھپھوندی کیوں لگتی ہے؟

روٹی (یا ڈبل روٹی) چند روز کی باسی ہو جائے تو اُس پر ہرے یا بھورے رنگ کے دھبّے سے پڑ جاتے ہیں۔ اِن دھبّوں کو پھپھوندی (اُرلی) کہتے ہیں۔ یہ دراصل ننھے ننھے پودے ہوتے ہیں اور خودرَو گھاس پھُوس کی طرح آپ ہی آپ اُگتے ہیں۔

پھپھوندی کے اِن ننھے ننھے پودوں کے بیج ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں، اور اِتنے باریک ہوتے ہیں کہ آپ اِنھیں دیکھ نہیں سکتے۔ جب یہ بیج کسی گرم کمرے میں کسی گیلی روٹی پر گرتے ہیں تو اُگنے لگتے ہیں۔ بالکُل اُسی طرح جیسے دوسرے پودوں کے بیج گرم اور گیلی مٹّی میں اُگتے ہیں۔ اِن کی شکل پھول کی طرح ہوتی ہے، لیکن اصل میں یہ پھول نہیں ہوتے۔

بعض وقت یہ بیج ایک گرم کمرے میں کسی گرم اور خشک روٹی پر گرتے ہیں۔ اِس حالت میں یہ نہیں اُگتے۔ دوسرے بیجوں کی طرح اِنھیں بھی اُگنے کے لیے نمی کی ضرورت ہوتی ہے۔

روٹی کے عِلاوہ دوسری چیزوں میں بھی پھپھوندی لگ جاتی ہے۔ مثلاً گوشت یا سبزیاں جو کسی گرم کمرے میں گیلی جگہ رکھی ہوئی ہوں۔ جام، چٹنی یا ساس وغیرہ کی بوتلیں کھُلی چھوڑ دی جائیں تو اُن میں بھی پھپھوندی لگ سکتی ہے۔ جُوتے، کتابیں اور کپڑے بھی گیلی جگہ رکھے ہوں تو پھپھوندی کا شکار ہو سکتے ہیں۔

(س-ل)

پھُول گوبھی

میں ہُوں گوبھی، زمیں کی حاصِل[1] ہُوں
سبزیوں کی میں جان ہُوں، دِل ہُوں

گوشت میں بھی مُجھے پکاتے ہیں
گوبھی آلُو بھی لوگ کھاتے ہیں

پھول جتنے بھی ہیں زمانے میں
اُن میں واحِد ہُوں میں پکانے میں

آب ہے میری موتیے کی آب
میں ہمیشہ ہُوں تازہ و شاداب

کس کو دعویٰ ہے برتری کا یہاں
مُجھ سے بڑھ کر ہے کس کا نام و نِشاں

ذائِقہ بھی مِرا مزے کا ہے
سبزیوں میں بھی نام اُونچا ہے

ننھّے مُنّوں میں ہُوں بہُت مقبول
وہ بھی ہیں پھول، میں بھی ہُوں اِک پھول

ناصِر زیدی

(1) پیداوار

ناراض درخت

عِفّت گُلِ اعزاز

Sharjeel Ahmed

گھر کے صحن میں بہت سے بچّے کھیل رہے تھے۔ شام کے وقت یہاں خوب رونق ہو جاتی تھی۔ بچّوں کی بھاگ دوڑ اور اُن کے شور و غُل کی وجہ سے عامِر کے لیے پڑھنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا کہ شاید شور کچھ کم ہو جائے، لیکن بچّے بے فکری سے شور مچائے جا رہے تھے، اِس لیے وہ اُٹھ کر باہر گیا۔ اُس نے دیکھا کہ دوسرے بچّے تو کھیل کُود رہے ہیں لیکن اُس کا چھوٹا بھائی صبیح کھیل نہیں رہا بلکہ جھاڑی کے پتّے توڑ توڑ کر نیچے پھینک رہا ہے۔

"صبیح!" عامِر نے اُسے آواز دی۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں" صبیح نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم یہ پتّے توڑ توڑ کے نیچے گرا رہے ہو۔ یہ دیکھو! تمھارے پیروں کے پاس پتّوں کا ڈھیر لگا ہُوا ہے۔ یہ کس نے توڑے ہیں؟"

"میں نے"۔

"کیوں توڑے ہیں؟ کیا اِن سے تمھیں کوئی نقصان ہو رہا تھا جو تم نے اِنھیں نوچ کے پھینک دیا؟" عامِر نے غصّے سے پُوچھا۔

"نقصان؟ اِن پتّوں سے؟ نہیں تو" صبیح نے کہا اور جھاڑی کی شاخ سے ایک اور پتّا توڑ کے نیچے پھینک دیا۔

"غلط بات ہے۔ پودے کے لیے پتّے بہت ضروری ہیں۔ اِنھیں اِس طرح تباہ نہ کرو"۔

"بس مجھے عادت ہو گئی ہے" صبیح نے بتایا "اچّھا لگتا ہے"۔

"یہ بُری عادت ہے۔ کسی بھی چیز کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ آیندہ تم کوئی پتّا نہیں توڑو گے۔ سمجھے؟ عامِر نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔ صبیح وہاں سے ہٹ کر بچّوں کے پاس چلا گیا۔

دو تین دن بعد عامِر نے دیکھا، صبیح گُلاب کے پودے کے پاس کھڑا ہے۔ اُس نے ایک پھول توڑا اور اُس کی پنکھڑیاں نوچ نوچ کے نیچے پھینکنے لگا۔ جب پھول کی سب پنکھڑیاں گر گئیں تو اُس نے پھول کی ڈنڈی کو بھی ایک طرف اُچھال دیا اور دوسرا پھول توڑنے لگا۔ عامِر نے پاس جا کے اُس کے مُنہ پر ایک تھپّڑ لگایا "منع کیا تھا تمھیں۔۔۔۔ باز نہیں آتے؟"

صبیح چُپ رہا، اُس کی نِگاہیں جُھکی ہُوئی تھیں "اب تم کوئی پھول یا پتّا نہیں توڑو گے۔۔۔ سمجھے؟" عامِر نے سختی سے کہا۔ صبیح کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

چند دن بعد عامر نے دیکھا کہ صبیح گلی میں کھڑا پڑوس کے ایک گھر میں لگے پودے کو چھیڑ رہا ہے۔ پودا چھوٹا سا تھا صبیح نے اُس کو ہلایا اور پھر اُس کے دو چار پتّے توڑ دیے۔ اِس کے بعد وہ ایک دوسرے پودے کے پتّے توڑنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو، صبیح؟" عامر نے پوچھا۔

"میں اپنے گھر کے پودے تو خراب نہیں کر رہا۔ یہ تو دوسروں کے پودے ہیں" صبیح بولا۔

"پودے چاہے اپنے گھر کے ہوں یا دوسروں کے، اُنھیں خراب نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے تمھیں سمجھایا تھا کہ پودے جان دار ہوتے ہیں۔ اِن کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ تم پودوں کے ساتھ دُشمنی کر رہے ہو۔ اِس طرح درخت ناراض ہو جائیں گے"۔

"آہاہا!۔ درخت بھلا کیسے ناراض ہو سکتے ہیں؟" صبیح نے ہنس کر کہا۔

"ہو سکتے ہیں۔ آیندہ تم یہ کام نہیں کرو گے۔ چلو، گھر جاؤ" عامر نے کہا۔ صبیح چلا گیا۔

گھر آکر اُس نے بستہ نکالا اور حساب کے سوال کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اُسے نیند آنے لگی تو وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک سرسبز و شاداب باغ میں ہے۔ ہر طرف رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ وہ گھاس پر بیٹھ گیا۔ پھر اُٹھا اور ہرے بھرے درختوں کے پاس چلا گیا۔ پھر اچانک اُس کا جی چاہا کہ ایک پتّا توڑے۔ اُس نے پتّا توڑ کے اپنی عادت کے مُطابق نیچے پھینک دیا۔ پھر ایک اور پتّا توڑا۔ اُسے پتّے توڑنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ اُسے پتا ہی نہ چلا اور ڈھیر سارے پتّے ٹوٹ کر نیچے جاگرے۔ اچانک اُس نے سامنے دیکھا تو درخت کے سب پتّے ٹوٹ چکے تھے۔ اب وہاں صِرف ڈنڈیاں بچی تھیں۔ پھر وہ ڈنڈیاں بھی نیچے گر پڑیں۔

"اوہ! کیا درخت ناراض ہو گیا؟"

اُسے عامر بھائی کی بات یاد آئی کہ درخت ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ اب اُس نے سامنے دیکھا تو تمام پودوں، جھاڑیوں اور درختوں کے پتّے ٹوٹ کر نیچے گر گئے تھے۔ ذرا دیر میں وہ درخت بھی زمین پر گر گئے۔ گھاس زرد ہو کے ایک دم غائب ہو گئی۔ سارے پھول مُرجھا گئے۔ جس جگہ سرسبز و شاداب باغ تھا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دم ویران اور اُجاڑ ہو گیا۔ پھر تیز دُھوپ چمکنے لگی۔ سورج سر پر آگیا۔ صبیح سوچنے لگا کہ کسی سایہ دار درخت کے نیچے چلا جائے۔ لیکن اب باغ میں کوئی درخت نہ تھا۔ سب گر گئے تھے۔

وہ باغ سے باہر نکلا تو دیکھا کہ دور دور تک کسی درخت کا نام نشان نہیں ہے۔ وہ اور آگے بڑھا کہ کہیں نہ کہیں تو کوئی درخت ہو گا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہر درخت نیچے گرا ہُوا تھا۔ چاروں طرف گرم لُو چل رہی تھی۔ اُسے پسینا آ رہا تھا۔ وہ بہُت پریشان تھا۔ اچانک اُسے ریڈیو کی آواز سُنائی دی "دُنیا کے سارے درخت اچانک سُوکھ کر گر گئے ہیں۔ تمام جنگلات ختم ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ صحرا اور ریگستان میں اُگنے والے کیکٹس اور کانٹے دار جھاڑیاں بھی ختم ہو گئی ہیں۔ سائنس دان سخت پریشان ہیں کیوں کہ درختوں کے بغیر اِنسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ درختوں ہی کی وجہ سے بُخارات نکلتے ہیں جن سے بادل بنتے ہیں اور بارش ہوتی ہے۔ بارش سے ہمارے کھیت سیراب ہوتے ہیں، فصلیں تیّار ہوتی ہیں۔ درختوں کی وجہ ہی سے ہمیں خوراک مِلتی ہے۔ پھل، سبزیاں، دالیں اور بہُت سی دوائیں مِلتی ہیں۔ سبز پتّے سورج کی روشنی میں درختوں کے لیے خوراک تیّار کرتے ہیں اور ہوا میں آکسیجن چھوڑتے ہیں، جو زندگی کے لیے بہُت ضروری ہے۔ اگر یہ پودے نہ رہے تو ہوا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مِقدار اِتنی بڑھ جائے گی کہ ہم سانس نہیں لے سکیں گے اور تڑپ تڑپ کے مر جائیں گے"۔

صبیح نے یہ سُنا تو گھبرا گیا۔ وہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگا۔ سارے راستے ویران ہو چکے تھے۔ سڑک کے کنارے جو درخت تھے، وہ سب نیچے گرے ہوئے تھے۔ شدید گرمی کی وجہ سے اُس کا بُرا حال تھا۔ وہ گھر میں داخل

ہُوا تو وہاں بھی سب درخت، جھاڑیاں، بیلیں اور پھول دار پودے مُرجھا چکے تھے۔

"یہ کیا ہو گیا بھائی جان؟" اُس نے عامر سے پوچھا۔

"درخت ناراض ہو گئے ہیں؟" عامر نے کہا۔

"درختوں کے بغیر ہم کیسے رہیں گے؟" صبیح نے کہا۔

"دیکھا تم نے، باہر کتنی سخت گرمی ہے۔ درخت آب و ہوا کو خوشگوار بناتے ہیں۔ فضا کی گرمی کو کم کرتے ہیں۔ اب تو دُنیا بالکل جہنّم کی طرح ہو جائے گی" عامر نے کہا۔

"جلانے کو لکڑی کہاں سے آئے گی؟" امّی نے پریشانی سے کہا۔ وہ کھانا پکانے جا رہی تھیں۔

"ماچس بھی نہیں ملے گی۔ کیوں کہ ماچس کی تیلی بھی لکڑی سے ہی بنتی ہے" باجی نے کہا۔

"اب نہ کتابیں چھپیں گی اور نہ کاپیاں ملیں گی۔ کیوں کہ درختوں کے گودے سے کاغذ بنتا ہے۔ اب کاغذ بھی نہیں بنے گا اور نہ اخبار رسالے نکلیں گے۔ نہ فرنیچر بنے گا اور نہ عمارتیں، کیوں کہ عمارتی لکڑی بھی درختوں سے ہی ملتی ہے"۔

"اُف میرے خدا! یہ کیا ہو گیا؟" باجی نے گھبرا کر کہا۔

"دنیا سے پودے ختم ہوئے تو یوں سمجھو کہ زندگی ہی ختم ہو گئی۔ خدا تعالیٰ نے اِس سیّارے یعنی زمین پر اِس لیے درخت پیدا کیے تھے کہ یہاں اِنسان اور جانور زندہ رہ سکیں۔ اُنہیں خوراک اور صاف ہوا مِل سکے۔ اُن کی زندگی کی بے شُمار ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ لیکن لوگوں نے درخت کاٹ ڈالے، جنگل ختم کر دیے، اور صبیح جیسے بہت سارے بچّوں نے درختوں کے پتّے توڑ ڈالے، جِن سے درخت ناراض ہو گئے اور ہماری دُنیا سے چلے گئے۔ اُنہوں نے ہم سے مُنہ موڑ لیا۔ یہی ہے ہماری سزا"۔ عامر کہہ رہا تھا۔

"کارخانوں اور فیکٹریوں سے نکلنے والے گندے تیزابی مادّے بھی پودوں کو تباہ کر رہے تھے۔ ایٹمی دھماکے بھی اُنہیں نقصان پہنچاتے رہے۔ وہ بے چارے کب تک انسان کے اِن مظالِم کا مقابلہ کرتے؟ وہ ہمارا ساتھ چھوڑنے

پر مجبور ہو گئے۔ ہم نے اُن پر ظُلم ڈھایا ہے" باجی نے کہا۔

صبیح کا دل گھبرانے لگا۔ اُسے محسوس ہُوا جیسے اِس تباہی و بربادی میں اُس کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ وہ درختوں کے پتّے توڑ توڑ کر ضائع کیا کرتا تھا۔ اُس نے سینکڑوں ہزاروں پتّے درختوں سے جُدا کر دیے تھے۔ اُس نے پودوں کو نُقصان پہنچایا تھا۔

"اے خدا! مجھے مُعاف کر دے۔ یہ میں نے کیا کیا؟ اے خدا! مجھے مُعاف کر دے" وہ بے حد شرمندہ تھا۔ "اب میں کوئی پتّا نہیں توڑوں گا۔ اب میں کسی پودے کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا"۔

"صبیح! صبیح! کیا ہُوا، صبیح؟..... اُٹھو صبیح!" بھائی جان کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی تو اُس نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر بھاگتا ہُوا باہر چلا گیا۔ سب درخت ہرے بھرے تھے۔ پھول کِھلے ہُوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی چڑیا ایک درخت کی شاخ پر بیٹھی چہچہا رہی تھی۔ اُس کی پیاری رسیلی آواز صبیح کو بہت اچھی لگی۔

"پیاری چڑیا! تم یوں ہی درختوں پر بیٹھ کر گیت گایا کرو۔ یہ سارے درخت ہرے بھرے رہیں۔ یہ پھول کِھلے رہیں۔ یہ سب ہمارے دوست ہیں۔ یہ درخت، یہ پودے، ہمارے سچّے دوست ہیں۔ اے دوستو! تُم ہم سے کبھی ناراض نہ ہونا۔ تم ہماری دُنیا کو سجائے رکھنا۔ اِس دُنیا کی رونق تم سے ہے" صبیح کہ رہا تھا۔

"اب تو تم پودوں کو ناراض نہیں کرو گے ناں؟" عامر بھائی نے پُوچھا۔

"نہیں، کبھی نہیں۔ اگر کوئی بچّہ پتّا توڑے گا تو میں اُسے منع کروں گا" صبیح نے کہا۔

عامر بھائی مسکرا دیے "شاباش تم بہت اچھے بچّے ہو"۔

"یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟" صبیح نے پوچھا۔

عامر کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی۔ اُس نے کہا "میں کچھ پودے لایا ہُوں۔ اب شجرکاری کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ آؤ، ہم دونوں مِل کر پودے لگاتے ہیں"۔ اور دونوں بھائی کیاری میں پودے لگانے لگے۔

کویل اپنا گھر کیوں نہیں بناتی؟

اکثر پرندوں کی مادائیں اپنا گھونسلا بناتی ہیں، اُس میں انڈے دیتی ہیں، انڈوں کو سیتی ہیں، اور جب اُن میں سے بچّے نکلتے ہیں تو اُنہیں پالتی پوستی ہیں۔ لیکن بعض پرندوں کی مادائیں ایسا نہیں کرتیں۔ وہ یوں ہی بے گھر بے در پھرتی رہتی ہیں، اور جب انڈے دینے کا وقت آتا ہے تو دوسرے پرندوں کے گھونسلوں میں انڈے دے دیتی ہیں۔ اُن کے انڈے یہی پرندے سیتے ہیں اور جب اُن میں سے بچّے نکلتے ہیں تو یہی سوتیلے ماں باپ اُن کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

ایسے پرندوں میں کویل بہت مشہور ہے۔ جب یہ انڈوں پر آتی ہے تو کسی ایسے پرندے کا گھونسلا تلاش کرتی ہے جس میں انڈے ہوں۔ انڈوں والی ماں خوراک کی تلاش میں باہر جاتی ہے تو کویل چُپکے سے اُس کے گھونسلے میں جا کر اُس کا ایک انڈا نیچے گرا دیتی ہے اور اُس کی جگہ خود انڈا دے دیتی ہے۔ اِس کے بعد وہ دوسرا گھونسلا ڈھونڈتی ہے اور اِس طرح تین چار گھونسلوں میں ایک ایک انڈا دیتی ہے۔

کویل پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور سری لنکا میں پائی جاتی ہے۔ اِسی سے مِلتا جُلتا ایک پرندہ یورپ کے ملکوں میں ہوتا ہے جسے کُکو (Cuckoo) کہتے ہیں۔ اِس کی مادہ بھی، کویل کی طرح، دوسرے پرندوں کے گھونسلوں میں انڈے دیتی ہے۔

سیر کو سوا سیر

صبا ارم

گھر میں آج کل خاصی گہما گہمی تھی۔ فرخ کے چچازاد بھائی بہن ماریہ اور شعیب کینیڈا سے آئے ہوئے تھے۔ اُن ہی دنوں اُس کے ماموں زاد بھائی بہن کامران، کاشف اور ندا بھی آگئے۔ سب میں اچھی خاصی دوستی تھی۔ خوب اُچھل کود ہوتی۔ گپیں ہانکی جاتیں۔ نت نئی شرارتیں سوچی جاتیں۔ لڑکے ماریہ وغیرہ کو تنگ کرتے۔ جواب میں ماریہ، ندا اور شائستہ باجی بھی ایک ہو جاتیں۔ اِس طرح خود بخود دو ٹیمیں بن گئیں۔ لڑکوں کی کوشش ہوتی کہ لڑکیوں کو نیچا دکھائیں اور لڑکیاں اُنھیں تنگ کرنے کے چکر میں رہتیں۔

اِسی طرح ایک شام کو سب باتوں میں مگن تھے کہ انور بھائی اچانک چلّا اُٹھے: "ارے! آئیڈیا!"

"کیا ہُوا؟ کسی بچھّو نے کاٹ لیا کیا؟" کامران مسکرایا۔

"نہیں تو، تم نے تو نہیں کاٹا" انور بھائی نے جواب دیا اور سب ہنس پڑے۔

"کیوں نہ کسی دن پکنک پر چلا جائے؟" انور بھائی نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔

"واہ! زبردست آئیڈیا ہے" کاشف نے کہا۔

"تو پھر کل ہی چلتے ہیں" فرخ بولا۔

"یہ اکیلے اکیلے کہاں چلنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں؟" ندا بولی۔

"تم سے مطلب؟ تم اپنے کام سے کام رکھو" شعیب نے کہا اور ندا اُسے گھورنے لگی۔

"ہم کل پکنک پر جا رہے ہیں" فرخ بولا۔

"ارے واہ!" ماریہ چلّا اُٹھی "ہم بھی چلیں گے"۔

"کوئی ضرورت نہیں، آرام سے گھر میں بیٹھو" کامران نے کہا۔

"اکیلے جا کے تو دکھاؤ۔ ہم ساتھ چلیں گے" شائستہ باجی نے کہا۔

"ارے تو، تم لوگ بھی کہیں چلے جاؤ" فرخ بولا۔

"نہیں، اکیلے کیا مزہ آئے گا" ماریہ بول اُٹھی۔

"تو مانتے ہو ناں، ساری رونقیں ہمارے ہی دم سے ہیں" شعیب مسکرایا۔

"ارے جاؤ، خوش فہمیاں ہیں تمہاری" ماریہ بولی۔ اُبھی خود ہی تو کہا تھا کہ ہمارے بغیر مزہ نہیں آتا" فرخ نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی، بات دراصل یہ ہے کہ بچے عموماً کارٹون اور جوکر جیسی چیزوں سے خوش ہوتے ہیں" شائستہ باجی نے کہا اور ماریہ اور ندا ہنس پڑیں۔

"آپ کا مطلب ہے ہم جوکر یا کارٹون ہیں؟" شعیب بُرا مان کر بولا۔

"تو کیا نہیں ہو؟" شائستہ باجی حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولیں اور اُن کے اِس انداز پر سب ہنس پڑے۔

"اچھا، خیر بات ہو رہی تھی پکنک کی۔ اور میں نے کہہ دیا ہے کہ ہم ساتھ چلیں گے" شائستہ باجی بولیں۔

"واہ! یہ اچھی زبردستی ہے" کاشف بول اٹھا۔

"ہاں، ہے تو زبردستی" ماریہ نے کندھے اچکائے۔

"چلو، تم بھی ہمارے ساتھ چلنا" انور بھائی نے گویا حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔

"لیکن ایک شرط ہے" شعیب نے کہا۔

"وہ کیا؟" ندا نے اُس کی طرف دیکھا۔

"تمام چیزیں گھر سے لے کر جائیں گے، خاص کر آلو کے پراٹھے اور بادام کا حلوا" شعیب نے کہا۔

"تم لوگ بھی ہمارے ساتھ کام کرو گے" ندا نے کہا۔

"چلو، منظور ہے" فرخ بولا۔ اور پھر وہ پروگرام سیٹ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ماریہ وغیرہ باہر نکل گئیں۔ شعیب نے چھلانگ لگائی اور انور بھائی کے قریب آ بیٹھا۔

"کیسی زبردست ترکیب ہے!" شعیب مسکرایا۔

"ہاں، کتنی آسانی سے ہمارے جال میں پھنس گئیں، حال آں کہ اگر ہمیں اکیلے ہی جانا ہوتا تو اِن کے سامنے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی" کاشف بولا۔

"اب آئے گا مزہ۔ سارے بدلے ایک ساتھ چکا دیں گے" فرخ ہنستے ہوئے بولا۔

"آہستہ بولو۔ کہیں سُن نہ لیں۔ سارا پروگرام گڑبڑ ہو جائے گا" کامران نے کہا۔

دوسرے دن صبح کو فجر کی نماز کے بعد سب تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ بڑوں سے اجازت پہلے ہی مل چکی تھی۔ ہر کوئی کسی نہ کسی کام میں مصروف تھا۔ ندا اور شائستہ باجی آلو کے پراٹھے بنانے میں مصروف تھیں، جب کہ کامران اور کاشف اُن کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ انور بھائی اور فرخ برتن صاف کر رہے تھے اور شعیب ٹوکری میں پھل رکھ رہا تھا۔ اُن کا ارادہ تھا کہ دس بجے تک نکل جائیں۔

"ابھی تک تو سب کام پروگرام کے مطابق ہو رہا ہے" کامران فرخ کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ بے چاریاں کتنی محنت کر رہی ہیں" فرخ بولا۔

"بڑی ہمدردی ہو رہی ہے اُن سے" کامران مسکرایا۔

"اِن شیطان کی خالاؤں سے ہمدردی؟ مجھے ابھی تک اِن کی اُس حرکت پر غصّہ ہے" شعیب بولا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن تم نے بھی تو ماریہ اور ندا کی چوٹیاں باندھ دی تھیں، اور پھر ماریہ پر دو موٹے تازے کاکروچ پھینک دیے تھے"۔

"اور جب ماریہ چیخ مار کر بھاگی تو ساتھ میں ندا بے چاری بھی گھسٹتی چلی گئی"۔

"اور جواب میں انہوں نے کیا حرکت کی" شعیب غصّے سے بولا اور کامران ہنس پڑا۔

ہوا یوں کہ اُس کے جواب میں اِن تینوں نے مِل کر ایک پروگرام بنایا۔ انہوں نے برفی کے ٹکڑے پلیٹوں میں رکھ دیے اور لڑکوں کو بلا کر ایک لائن میں کھڑا کر دیا۔

"یہ ایک چھوٹا سا مقابلہ ہے" شائستہ باجی نے اونچی آواز میں کہا "جب میں کہوں تو آپ سب آگے بڑھ کر برفی کا ایک ایک ٹکڑا اُٹھالیں۔ جس نے سب سے پہلے کھا لیا، اُسے چاکلیٹ کا یہ ڈبّا ملے گا" شائستہ باجی نے چاکلیٹ کا ڈبّا دکھا کر کہا۔ اور پھر اُن کے تین تک گنتے ہی سب لڑکے برفی پر جھپٹ پڑے۔ شعیب اور کامران نے تو پورا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا اور پھر اُن کی تھُو تھُو شروع ہو گئی۔

"یہ...... یہ کیا؟" انور بھائی بولے، کیوں کہ اُن کے منہ میں صابُن گھُلا جا رہا تھا۔ تینوں لڑکیاں منہ پر ہاتھ رکھے ہنس رہی تھیں۔ سب لڑکے باتھ روم کی طرف دوڑے اور جب تک وہ منہ صاف کر کے باہر آتے، لڑکیاں چاکلیٹ کا ڈبّا خالی کر چکی تھیں۔

"اُف! سارا دن میرے منہ کا ذائقہ خراب رہا۔ انہوں نے صابُن کو کاٹ کر برفی کے ٹکڑوں کی طرح پلیٹ میں سجا دیا تھا" شعیب نے منہ بنایا۔

"خیر، آج مزہ چکھائیں گے اِن کو" فرخ نے مسکرا کر کہا۔
تھوڑی دیر میں سب چیزیں تیّار ہو گئیں۔ چُناں چہ وہ سب بھی تیّار ہونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔
"انور بھائی، سب چیزیں میں نے باندھ دی ہیں" نِدا چلّائی "پہلے اِنہیں کار کی ڈِکّی میں رکھ دیں"۔
انور بھائی نے ندا کی مدد سے چیزیں کار کی ڈِکّی میں رکھ دیں۔ اب وہ سب تیّار ہو کر انور بھائی کے کمرے میں کھڑے تھے۔ لیکن کاشِف اور کامران ابھی تک تیّاری میں مصروف تھے۔
"کب چلنا ہے؟" ماریہ نے پوچھا۔
"آرام سے چلیں گے" انور بھائی بیٹھتے ہوئے بولے "ابھی تو پونے دس ہوئے ہیں"۔
اُنھوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ ایسے میں انور بھائی نے فرخ اور شعیب کو اِشارہ کیا تو وہ مسکرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔
"تم کہاں جا رہے ہو؟" ماریہ بولی۔
"کہیں نہیں۔ بس اِدھر ہی ہیں۔ بیٹھنے کو دل نہیں کر رہا۔ لان میں جا رہے ہیں" شعیب نے کہا اور فرخ کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔
"یہ کاشی اور کامی ابھی تک تیّار نہیں ہوئے؟" شائستہ باجی نے کہا۔
"پتا نہیں" انور بھائی بولے اور پھر باتیں کرنے لگے۔
تھوڑی دیر بعد وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔
"اب آپ کہاں چلے؟" شائستہ باجی بولیں۔
"کاشف وغیرہ کو دیکھ آؤں۔ ابھی تک تیّار نہیں ہوئے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ تیّار ہو کے میرے کمرے میں آجانا" اُنھوں نے کہا اور باہر نکل گئے۔ ماریہ، نِدا اور شائستہ باجی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔
"کوئی گڑ بڑ لگتی ہے۔ میرا خیال ہے یہ کوئی چکّر چلانے کے چکّر میں ہیں" ماریہ جلدی سے بولی۔
"ہائیں! چکّر چلانے کا چکّر؟ بھئی واہ! کیا جُملہ ہے!" شائستہ باجی ہنسیں "ویسے ماریہ کا خیال ٹھیک لگتا ہے۔ آؤ، دیکھتے ہیں"۔
وہ تینوں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اِسی اثنا میں گاڑی اِسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔
"ارے! یہ کیا؟" نِدا چِلّا اُٹھی۔ تینوں بھاگ کر کھڑکی کے پاس گئیں اور باہر جھانک کر دیکھا تو انور بھائی گاڑی اِسٹارٹ کر چکے تھے اور گاڑی باہر نکل رہی تھی۔ سب لڑکے اُنہیں دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگے۔ نِدا، ماریہ اور شائستہ باجی باہر کی طرف دوڑیں لیکن گاڑی ہَوا ہو چکی تھی۔ لڑکے گاڑی میں بیٹھے زور زور سے ہنس رہے تھے۔
"واہ! مزہ آگیا!" کامران بولا "کتنے شوق سے تیّار ہُوئی تھیں، بے چاریاں۔ ویسے محنت تو اُنھوں نے بہُت کی تھی۔ اب سر پکڑے بیٹھی ہوں گی"۔
"ہاں، واقعی بہُت محنت سے یہ چیزیں تیّار کی تھیں اُنھوں نے" انور بھائی نے کہا۔
"اب پتا چلے گا، ہم سے ٹکّر لینے کا انجام کیا ہوتا ہے" کاشِف بولا۔
سب اپنے پروگرام کی کام یابی پر بہُت خوش تھے۔ سوچ رہے تھے کہ گھر جا کے خوب مذاق اُڑائیں گے اُن کا۔
وہ فٹ بال وغیرہ لے کر گئے تھے۔ سب نے مِل کر خوب دھما چوکڑی مچائی۔ دو گھنٹے بعد سب تھک چکے تھے۔
"اُف! اب کچھ کھایا پیا جائے۔ بہُت بھوک لگ رہی ہے" کامران پیٹ پکڑتے ہوئے بولا۔
"ہاں، چلو" انور بھائی بیٹھتے ہوئے بولے۔
"آہا! آلو کے پراٹھے اور اُن کے ساتھ آم کی چٹنی! مزا آگیا!" شُعیب نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔
"اور چیزیں بھی تو ہیں۔ سینڈوِچ، بادام کا حلوا" کاشف نے کہا۔
وہ زمین پر چادر بچھا کر بیٹھے تھے۔ انور بھائی سامان کھول رہے تھے۔

"انور بھائی، جلدی کریں۔ نکالیں ناں چیزیں" فرّخ اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ لیکن انور بھائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سب انور بھائی کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاتا ہوں" فرخ آگے بڑھا، لیکن جُوں ہی اُس نے ایک برتن کا ڈھکّن اُٹھایا، حیرت سے چلّا اُٹھا۔

"کیا ہُوا؟" وہ سب اُس کی طرف بڑھے اور پھر اُس کے ساتھ خود بھی چلّانے لگے۔ تمام برتن خالی تھے!

"یہ..... یہ سب کیا ہے؟ ندا نے تو ہمارے سامنے سب سامان باندھا تھا" شعیب بولا۔

"زبردست چوٹ ہوگئی۔ ہم اُنہیں چکّر دے رہے تھے اور خود اُن کے چکّر میں آگئے۔ اِس کو کہتے ہیں سیر کو سَوا سیر" انور بھائی نے مُنہ بنایا۔

"کیا مطلب؟" شُعیب نے پُوچھا تو انور بھائی نے ایک کاغذ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ بولے "یہ سامان میں سے نکلا ہے" سب جلدی سے کاغذ پر جُھکے۔ لِکھا تھا:

"بڑے چالاک بنے پھرتے ہو۔ ہمیں اُسی وقت شک ہوگیا تھا جب ہمارے سامنے پکنک پر جانے کی بات کی تھی۔ سب چیزیں ہم لے کر جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ کام کرنے کا شکریہ"۔

"اب کیا کریں؟" فرخ رونی صورت بنا کے بولا "مجھے تو بہُت بھوک لگی ہے"

"کرنا کیا ہے؟ گھر چلو" کامران نے کہا۔

"خیر، چھوڑیں گے ہم بھی نہیں" کامران دانت پیستے ہوئے بولا۔ اور پھر وہ سر جوڑے نئی ترکیب کی سوچ میں گُم ہوگئے۔

چوٹ لگے تو درد کیوں ہوتا ہے؟

آپ دوڑتے دوڑتے گر پڑتے ہیں۔ آپ کا گُھٹنا کسی سخت چیز سے ٹکراتا ہے اور آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس پر چوٹ لگی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آپ کو کس طرح معلوم ہُوا کہ آپ کے گُھٹنے پر چوٹ لگی ہے؟ جواب یہ ہے کہ گُھٹنے یا کسی بھی عضو پر چوٹ لگے تو اُس عضو کے اعصاب فوراً دماغ کو بتا دیتے ہیں کہ اُس میں درد ہو رہا ہے، اور اِسی درد سے آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس عضو پر چوٹ لگی ہے۔

ہمارے جِسم میں باریک باریک دھاگوں کا جال بِچھا ہُوا ہے۔ اِن لمبے اور باریک دھاگوں کو درد کے اعصابی خلیے (Pain Nerve Cells) کہتے ہیں۔ یہ اعصابی خلیے دماغ سے جُڑے ہوئے ہیں، اور زیادہ تر سوئے رہتے ہیں۔ لیکن جب اِن پر چوٹ لگتی ہے تو ایک دم بیدار ہو جاتے ہیں اور سیکنڈ کے چوتھائی حصّے میں دماغ کو خبر کر دیتے ہیں کہ جسم کے فلاں حصّے پر چوٹ لگی ہے۔

ہمارے جِسم میں لاکھوں درد کے اعصابی خلیے موجود ہیں۔ بعض جگہ یہ قریب قریب ہیں اور بعض جگہ دُور دُور۔ جس جگہ یہ قریب قریب ہیں، وہاں چوٹ کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اور جہاں دُور دُور ہیں، وہاں کم۔ ناک پر مُکّا لگے تو زیادہ درد ہوتا ہے، کیوں کہ ناک کے اعصابی خلیے قریب قریب ہوتے ہیں۔ لیکن یہی مُکّا ران پر مارا جائے تو اِتنا درد نہیں ہوتا، کیوں کہ ران کے اعصابی خلیے دُور دُور ہوتے ہیں۔

درد کے اِن اعصابی خلیوں کے سِگنل دماغ تک 200 میل فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جوں ہی آپ کے جسم کے کسی حصّے پر چوٹ لگتی ہے، آپ کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے اور اِس کے ساتھ ہی آپ کے مُنہ سے "اُف" یا "ہائے" کی آواز نکلتی ہے۔

اب آپ پُوچھیں گے کہ جب نائی آپ کے بال کاٹتا ہے تو بالوں میں درد کیوں نہیں ہوتا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ بالوں میں درد کے اعصابی خلیے نہیں ہوتے۔ البتّہ کھوپڑی میں یہ خلیے ہوتے ہیں۔

(س-ل)

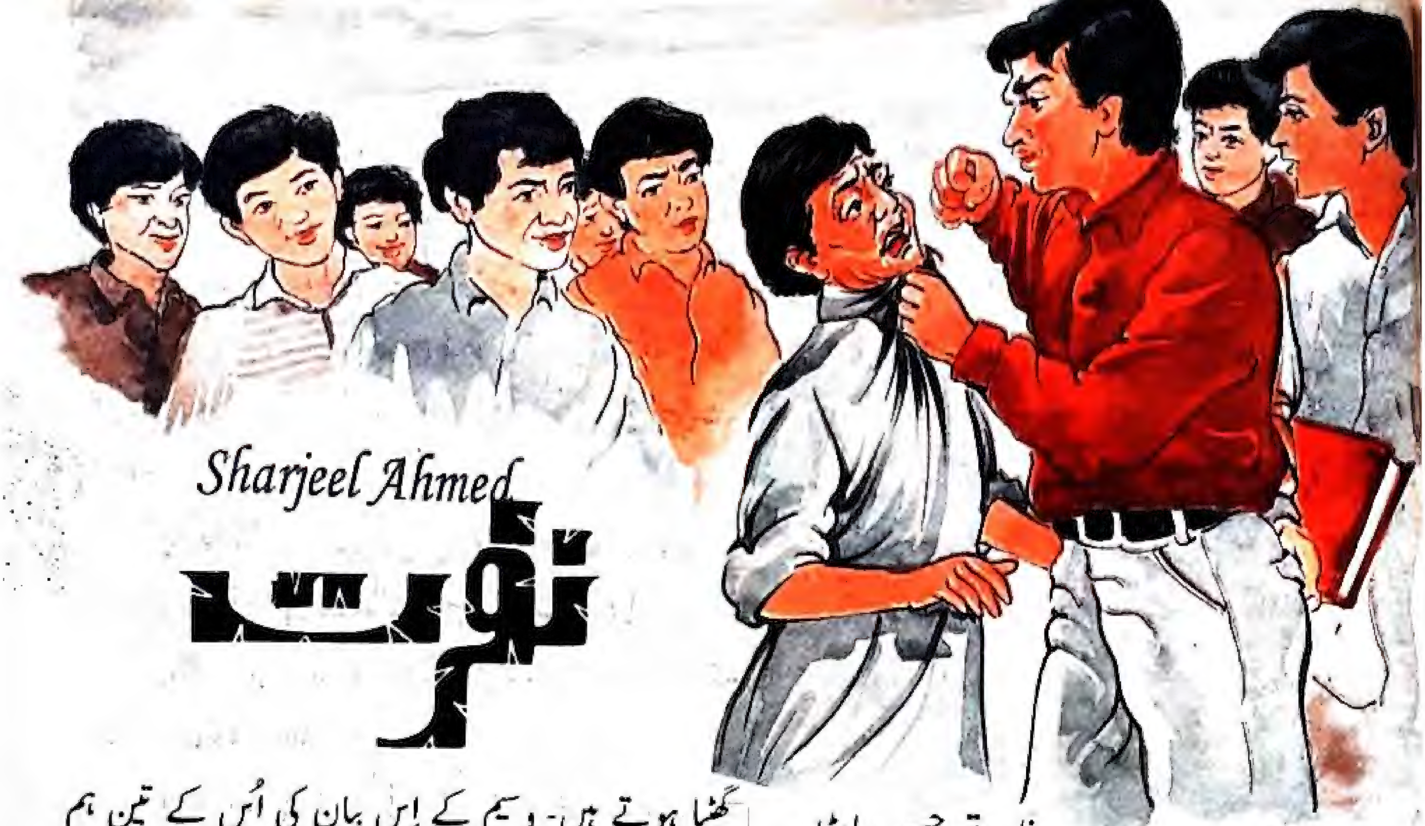

نفرت

فاروق حسن چانڈیو

"اُٹھو، اِس ڈیسک سے" وسیم نے صِدّیق سے کہا۔

"کیوں، وسیم بھائی؟" صِدّیق نے وجہ پُوچھی۔

"اِس لیے کہ تم ایک معمولی جھاڑو لگانے والے کے یٹے ہو۔ مجھے جھاڑو دینے والے کے بیٹے کے ساتھ بیٹھنا ند نہیں ہے" وسیم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"محنت کر کے حلال روزی کمانا تو عین عبادت ہے۔ ی عبادت گزار شخص یا اُس کی اولاد سے نفرت کرنا اچھی ت نہیں۔ پھر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟" صِدّیق نے بڑی ی سے پوچھا۔

"چھوڑو بے کار کی بحث کو۔ اُٹھو، یہاں سے" وسیم غصّے سے کہا۔

"میں نہیں اُٹھوں گا.... یہ ڈیسک سرکاری ہے...... پر میرا بھی اِتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا" صِدّیق نے بھی نے سے جواب دیا۔

وسیم اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور صِدّیق کو گریبان سے پکڑ دھکا دیا۔ عین اُسی وقت ماسٹر صاحب آگئے۔ اُنھوں نے سے لڑنے کی وجہ پُوچھی۔ وسیم نے کہا کہ صِدّیق نے ے بُرا بھلا کہا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ دولت مند لوگ بہت گھٹیا ہوتے ہیں۔ وسیم کے اِس بیان کی اُس کے تین ہم جماعت دوستوں نے بھی تصدیق کی۔ جواب میں صِدّیق نے اِس بات کی تردید کی اور سچ سچ بات بتائی۔ مگر کسی طالبِ علم نے اُس کے حق میں گواہی نہیں دی، کیوں کہ وہ سب وسیم اور اُس کے دوستوں سے ڈرتے تھے۔ چُناں چہ ماسٹر صاحب نے صِدّیق کو بُری طرح ڈانٹا اور وہ بے چارہ آنسوُ بہا کر خاموش ہوگیا۔

وسیم نے اپنے دوستوں کو بتایا تھا کہ اُس کا بڑا بھائی سعودی عرب میں اپنا کاروبار کرتا ہے اور وہاں سے اُسے بہت پیسے بھیجتا ہے۔ وہ اِسکول میں خوب دل کھول کر پیسے خرچ کرتا تھا۔ خود بھی کھاتا اور اپنے دوستوں کو بھی کھلاتا۔ اِس وجہ سے اُس کے دوست لڑائیوں میں اُس کا ساتھ دیتے تھے۔

صِدّیق اُسی اِسکول کے چپراسی کا بیٹا تھا اور بہت ذہین اور بااَخلاق تھا۔ ہر ایک سے محبّت سے پیش آتا۔ وسیم اور اُس کے دوستوں کے سِوا باقی سب طالبِ علم اُسے پسند کرتے تھے۔

ایک دن وسیم اور اُس کے دوست آدھی چھُٹّی کے دوران میں، اِسکول کے باغیچے میں، درخت کی چھاؤں میں بیٹھے کچھ کھا پی رہے تھے۔ صِدّیق بھی اُن کے قریب جا بیٹھا۔

وسیم نے اُسے اُٹھ جانے کو کہا مگر اُس نے اِنکار کر دیا۔ تب وسیم اور اُس کے دوستوں نے اُسے خوب مارا۔ عین اُسی وقت وہاں ایک اجنبی نوجوان آگیا۔ اُس نے بیچ بچاؤ کرانے کے بعد لڑنے کی وجہ پُوچھی۔ وہ اُستاد تو نہ تھا کہ وسیم ڈر کر جھوٹے بہانے بناتا۔ اُس نے جلے کٹے لہجے میں کہا کہ ایک معمولی جھاڑو لگانے والے کا بیٹا ہماری برابری کرتا ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں۔ اِس لیے مارا ہے۔

"جھاڑو لگانا کوئی بُرا کام تو نہیں۔ تمہارے رشتے داروں میں سے بھی کوئی نہ کوئی ایسا کام کرتا ہوگا" اجنبی نے سمجھاتے ہُوئے کہا۔

"میرے رشتے دار کوئی گھٹیا کام نہیں کرتے۔ میرے بھائی محمدؐ سلیم سعودی عرب میں اپنا کاروبار کرتے ہیں" وسیم نے فخر سے بتایا۔

"تو...... تم محمدؐ سلیم کے بھائی وسیم ہو؟ وہ تو......"۔ اجنبی نے جُملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اُسے سمجھاتے ہوئے بولا "وسیم میاں' جھاڑو لگانا کوئی گھٹیا کام نہیں۔ اگر یہ گھٹیا اور بُرا کام ہوتا تو ہماری عورتیں یا مرد اپنے گھروں میں جھاڑو نہ دیتے۔ کیا تمہاری ماں بہنیں گھر میں جھاڑو نہیں دیتیں؟"

وسیم ایک دم بھڑک اُٹھا۔ چیخ کر بولا "جاؤ' جاؤ' اپنا راستہ ناپو۔ زیادہ بک بک نہ کرو"۔

"میں تمہارے بڑے بھائی سلیم کا دوست ہوں۔ وہ سعودی عرب میں میرے ساتھ ایک کارخانے میں جھاڑو لگاتا اور مشینیں صاف کرتا ہے۔ اُس نے تمہیں گھڑی بھیجی ہے۔ اُس نے مجھے منع کیا تھا کہ کسی کو اُس کے کام کے بارے میں نہ بتاؤں۔ اب تمہارا دماغ ٹھیک کرنے کے لیے بتانا ضروری ہوگیا ہے۔ اگر جھاڑو لگانا تمہاری نظر میں گھٹیا کام ہے تو اب اپنے بھائی سے بھی نفرت کرنا" یہ کہہ کر اجنبی نوجوان نے جیب سے گھڑی نکال کر وسیم کے ہاتھ میں تھما دی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔

وسیم شرم کے مارے مُنہ جُھکائے اسُی وقت گھر چلا گیا۔

وہ شرم کے مارے اِسکول نہیں جا رہا تھا۔ تقریباً دو ہفتے بعد جب والِد نے بہُت سمجھایا تو اِسکول گیا۔ وہ جیسے ہی اِسکول میں داخل ہوا' لڑکوں نے زور دار قہقہے لگا کر اُس کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا۔ تب صِدّیق نے اُن سے اِلتجا کی کہ وہ وسیم کا مذاق نہ اُڑائیں۔

صِدّیق کا یہ برتاؤ دیکھ کر وسیم حیران رہ گیا۔ وہ تو راستے بھر یہ سوچتا آیا تھا کہ صدیق اُس سے بدلہ لے گا اور اُس کا خوب مذاق اُڑائے گا۔ مگر اُس نے تو دوسروں کو ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔ یہ دیکھ کر اُس کا سویا ہُوا ضمیر جاگ اُٹھا اور اُس نے لوگوں کی پروا کیے بغیر بھرے مجمعے میں گِڑگِڑا کر صِدّیق سے مُعافی مانگی۔ صِدّیق نے اُسے گلے لگا کر مُعاف کر دیا۔

بقیہ عظیم مُسلمان

ریاست کا تصوّر پیش کیا جو بعد میں پاکستان کے مُطالبے کی صورت میں سامنے آیا۔

آپ نے مسلم قوم کو بیدار کرنے کے لیے شاعری کا سہارا لیا اور مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ آپ نے کئی موقعوں پر مختلف کانفرنسوں میں مسلمانوں کی نُمائندگی کے فرائض ادا کیے اور قائدِاعظمؒ کو مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے ترغیب دیتے رہے۔ آپ اپریل 1938ء میں لاہور میں اللہ کو پیارے ہوگئے اور آپ کو آپ کی اسلامی خدمات کے پیشِ نظر شاہی مسجد لاہور کے دامن میں دفن کیا گیا۔

قائدِاعظمؒ نے 1940ء میں قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد ایک دفعہ علاّمہ اِقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا "گو آج علاّمہ اقبالؒ ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو انہیں یہ دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی کہ آج مسلم قوم نے ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا پختہ عزم کرلیا ہے"۔ عین الحق فرید کوٹی

مَیں ہُوں پاکستانی بچّہ

میں ہُوں پاکستانی بچّہ
بات کا پکّا، دِل کا سچّا
پڑھنے میں بھی سب سے اچّھا
لِکھنے میں بھی سب سے اچّھا
ابُّو امّی کا میں دُلارا
دِل کی ٹھنڈک، آنکھ کا تارا
بھائی بہنوں کا بھی پیارا
خوشیوں کا اِک گھر ہے ہمارا
اپنوں سے میں لڑتا نہیں ہُوں
دُشمن سے میں ڈرتا نہیں ہُوں
محنت سے میں پڑھتا رہُوں گا
سب سے آگے بڑھتا رہُوں گا
میں ہوں پاکستانی بچّہ
بات کا پکّا، دِل کا سچّا

محمّد عارِف قُریشی

آسمان کا رنگ کیسا ہے؟

سامان: گلاس۔ پانی۔ دُودھ۔ ٹارچ۔

بعض لوگ کہتے ہیں، آسمان کا رنگ نیلا ہے اور بعض کہتے ہیں، آسمان کا رنگ نیلا دکھائی دیتا ہے۔ اِن دونوں باتوں میں کون سی بات صحیح ہے؟

جو خلاباز خلا میں جاتے ہیں، اُنہیں خلا میں پہنچ کر آسمان کا رنگ سیاہی مائل نیلا نظر آتا ہے اور زمین پر رہنے والوں کو مغرب کے وقت آسمان کا رنگ پیلا اور سُرخ دکھائی دیتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ روشنی میں سات رنگ ہوتے ہیں۔ فضا میں موجود پانی کے قطرے اور خاکی ذرّات نیلے رنگ کی کِرنوں کو دُور دُور تک پھیلا دیتے ہیں، لیکن باقی رنگوں کی کِرنوں کی راہ میں کوئی چیز رُکاوٹ نہیں بنتی اور وہ آبی اور خاکی ذرّات میں سے بخوبی گزر جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آسمان کا رنگ ہمیں نیلا دکھائی دیتا ہے اور یہی بات صحیح ہے۔

یہ تجربہ کرنے کے لیے کہ نیلے رنگ کی کرنیں پھیل جاتی ہیں، آپ ایک آسان تجربہ کر سکتے ہیں۔ شیشے کے گلاس میں پانی بھر لیں اور پھر اُس میں چند قطرے دُودھ کے ڈال دیں۔ گلاس میں دودھ کے ذرّات وہی کام کریں گے جو فضا میں آبی اور خاکی ذرّات کرتے ہیں۔

اب ایک تاریک کمرے میں گلاس کو رکھ کر اُس کی باہر کی سطح کے بالکل ساتھ ٹارچ لگا کر جلا دیں اور ایسے زاویے سے دیکھیں کہ ٹارچ کے ساتھ آپ کی نظریں زاویہ قائمہ بناتی ہوں (گلاس چہرے کے سامنے رکھیں اور دائیں ہاتھ سے ٹارچ گلاس سے لگا دیں)۔ اِس روشنی میں آپ کو یہ دُودھ مِلا پانی سفید نہیں بلکہ نیلا نظر آئے گا۔

وجہ یہی ہے کہ نیلے رنگ کی کرنیں دودھ کے ذرّات کی وجہ سے دوسرے رنگ کی کرنوں کی نِسبت زیادہ دُور تک پھیل جاتی ہیں۔

شیشے سے تصویر بنائی جاسکتی ہے

سامان: شیشے کا مُستطیل ٹکڑا۔ کاغذ اور پنسل

تصویریں بنانا نہایت اچّھا مشغلہ ہے۔ لیکن جو بچّے تصویریں نہیں بنا سکتے اور سامنے کوئی تصویر رکھ کر اُس کی نقل بھی نہیں کر سکتے، وہ ایک اور طریقے سے اپنا شوق پُورا کر سکتے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے:

ایک بڑا سا کاغذ لیں اور اُس کے قریب ایک شیشہ ترچھا کھڑا کریں۔ اب اِس شیشے کے سامنے آپ جو بھی چیز رکھیں گے وہ کاغذ پر نظر آئے گی۔

وجہ یہ ہے کہ شیشے کے سامنے پڑی ہوئی چیز کا عکس شیشے کی سطح سے مُنعکس ہو کر آپ کی آنکھوں تک پہنچتا ہے مگر اِس کے ساتھ ہی کاغذ پر پڑتی ہوئی شُعاعیں بھی شیشے میں سے گزر کر آپ کی آنکھوں تک پہنچتی ہیں۔ چُناں چہ اگر آپ اپنا سر نہ ہِلائیں تو آپ اُس چیز کا عکس آسانی سے ٹریس کر سکتے ہیں۔

آپ شیشے کو ہاتھ سے پکڑنے کے بجائے اُسے اِسٹینڈ پر بھی لگا سکتے ہیں۔ یہ اِسٹینڈ لکڑی کے دو ڈنڈوں سے بنایا جا سکتا ہے۔

Sharjeel Ahmed

آپ بھی تو وہاں تھیں!

ایک دِن میرا چھوٹا بھائی صبح کو اُٹھ کر امّی سے کہنے لگا "امّی، میں نے ایک بہت اچھا خواب دیکھا ہے"۔

امّی نے کہا "بتاؤ، کیا دیکھا؟"

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا "میں اچھی طرح نہیں بتا سکتا۔ آپ ہی بتا دیں"۔

امّی نے کہا "لیکن بیٹا، خواب تو تُم نے دیکھا ہے، میں نے نہیں"۔

وہ بولا "کیا ہُوا۔ آپ بھی تو وہاں تھیں"۔

یہ سُننا تھا کہ سب گھر والے ہنس پڑے۔ اور آپ بھی یقیناً ہنس رہے ہوں گے۔

(سُفیان اصغر، موہری شریف۔ اِنعام: 25 روپے کی کتابیں)

ابّو کی شادی

میری باجی ایک اِسکول میں نرسری کلاس کو پڑھاتی ہیں۔

ایک دن وہ کلاس ورک کروا چکیں تو ایک بچّہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کے پاس آیا اور اُن سے کہا کہ مِس، آج میرے ماموں کی شادی ہے۔ امّی نے کہا تھا کہ آج مِس سے جلدی چھُٹی لے کر آ جانا۔ باجی نے اُس کو چھُٹی دے دی۔

اُس کی دیکھا دیکھی ایک اور بچّہ اُٹھ کر آیا اور کہنے لگا "مِس میرے ابّو کی شادی ہے۔ مجھے بھی چھُٹی دے دیں"۔

جب باجی نے یہ واقعہ گھر آ کر ہمیں بتایا تو ہم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ (فرح شفیق، واہ چھاؤنی)

تعلیم و تربیت

ایک دفعہ میرا بڑا بھائی، جو کہ بہت بھولا تھا، میرے ساتھ بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ٹی وی پر اذان کے بعد یہ حدیث آئی "باپ جو عطیّے اپنی اولاد کو دیتا ہے، اُن میں سے بہترین عطیہ اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت ہے"۔

یہ پڑھ کر وہ مجھ سے کہنے لگا "حسن، وہ تو ابّو ہمیں ہر مہینے لا دیتے ہیں"۔

یہ سُن کر میں ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔ (حسن یعقوب چیچہ وطنی)

کیک

ہمارے گھر مہمان آ رہے تھے، اور مہمان بھی خاص قسم کے۔ اِس لیے کافی اِہتمام ہو رہا تھا۔ اِتفاق کی بات دیکھیے کہ اُس وقت گھر میں کوئی مرد موجود نہ تھا۔ میری امّی نے مجھ سے اور میری کزن ثمینہ سے (جو مجھ سے تین سال بڑی ہیں) کہا کہ تم بِسکٹ اور کیک لے آؤ۔ میں اُس وقت جماعت پنجم میں پڑھتی تھی۔

ثمینہ باجی نے مجھے ساتھ لیا اور چل پڑیں۔ مہمانوں کے آنے میں تھوڑی دیر تھی۔ ہم دونوں پر اُس وقت گھبراہٹ سوار تھی۔ بھاگم بھاگ دُکان پر پہنچے۔ بیکری کی دکان کے بالکُل ساتھ وڈیو کیسٹ والے کی دکان ہے۔ دونوں دکانوں کے باہر شیشے کی دیواریں بنی ہوئی ہیں' اِس لیے میری کزن دھوکے میں وڈیو کیسٹ والی دکان میں گھس گئیں۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہ دیا اور دکان دار سے کہنے لگیں "بھائی، کیک ہے؟"

بھائی نے حیران ہو کر اپنے ساتھی سے پوچھا "کیک کون سی فِلم ہے؟"

اُس نے کہا "مجھے تو نہیں معلوم"۔

اب وہ ثمینہ باجی کی طرف مُتوَجِّہ ہُوا "باجی' یہ آڈیو کیسٹ ہے یا وڈیو کیسٹ؟"

ثمینہ باجی گھبرائی ہوئی تھیں۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بولیں "بھائی' میں نے کیک مانگا ہے۔ کیسٹ کا مجھے اچار ڈالنا ہے؟"

یہ سُن کر دکان دار قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ میرے مُنہ سے بھی ہنسی کا فوّارہ پھوٹ نکلا۔ دکان دار بولا "یہاں تو آپ کو کیسٹ ہی ملے گی۔ کیک کی دکان ساتھ والی ہے"۔

ثمینہ باجی بے چاری اُس وقت اِس قدر شرمندہ ہوئیں کہ بتا نہیں سکتی۔ آج بھی جب وہ واقِعہ یاد آتا ہے تو ہنسی رُکنے کا نام نہیں لیتی"۔ (نوشین بُخاری' سرگودھا)

انڈے دینے ہیں

ہم چند دوست بازار میں کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ سامنے سے ہمارے ایک اور دوست شمسُ الدّین آتے دکھائی دیے۔ اُن کے ہاتھ میں لفافہ تھا۔ ہم نے اُنہیں بُلایا تو وہ بولے "مُعاف کرنا' بھائی۔ میں بہُت جلدی میں ہُوں۔ مجھے فوراً گھر جا کر انڈے دینے ہیں"۔

یہ سُن کر ہم سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

(محمد سلیم' پوٹہ ڈی آئی خان)

آنکھیں چار ہونا

بعض اوقات مُحاورے طالب علموں کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست تھے' ذرا نالائق قسم کے۔ ایک دفعہ سالانہ اِمتحان میں' اُردو کے پیپر میں' ایک مُحاورہ دیا گیا "آنکھیں چار ہونا"۔ اِس مُحاورے کو جُملے میں اِستعمال کرنا تھا۔

ہمارے دوست نے جُملہ کچھ یُوں لکھا:

"جب میں اور میرا دوست آمنے سامنے آئے تو اُس کی اور میری آنکھیں مِل کر چار ہو گئیں"۔

جب اُنہوں نے ہمیں یہ جُملہ سُنایا تو ہم خوب ہنسے۔ ہمارے دوست حیرت سے ہمارا مُنہ تک رہے تھے۔

(فتح محمد عرشی' پائی خیل ضلع میانوالی)

فون کی گھنٹی

ایک دن ہم سب کھانا کھا رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی کسی نے ریسیور نہیں اُٹھایا۔ گھنٹی مُسلسل بجتی رہی تو میری چھوٹی بہن فون کی طرف غصّے سے دیکھتے ہوئے بولی "ذرا صبر بھی کرو۔ ابھی آتے ہیں۔ نظر نہیں آ رہا' کھانا کھا رہے ہیں؟" (صوفیہ اسلم' لیاقت پور)

بِل

ایک دفعہ ہمارے ابّو اخبار والے کا بِل کہیں رکھ کر بھول گئے۔ اُنہوں نے مُلازِم سے کہا "تم نے اخبار والے کا بِل تو نہیں دیکھا؟"

مُلازِم بولا "صاحِب' میں تو پہلی مرتبہ سُن رہا ہوں کہ اخبار والے بِل میں رہتے ہیں"۔

ابّو نے جب یہ بات ہمیں بتائی تو ہمارا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا۔ (قاسم جُنید' نوید' کراچی)

ناصر روتا ہُوا اِسکول سے گھر آیا تو ماں نے پُوچھا "بیٹے، رو کیوں رہے ہو؟"

"ماسٹر صاحِب نے مارا ہے" ناصر ہچکیاں لیتے ہُوئے بولا۔

"کیوں مارا ہے؟" ماں نے پُوچھا۔

"ماسٹر صاحِب کی کُرسی پر روشنائی گری ہوئی تھی۔ وہ بیٹھنے لگے تو میں نے سوچا کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ میں نے پیچھے سے کُرسی کھینچ لی" ناصر نے جواب دیا۔

(اسار اخلیل احمد خاں، ساہی وال)

ٹرین میں نیچے والی سیٹ پر بیٹھے ہُوئے ایک شخص نے نئے آنے والے مسافر سے کہا "آپ اِتنا بڑا صندوق اُوپر برتھ پر نہ رکھیں۔ ہو سکتا ہے یہ میرے اُوپر آگرے"۔

"فِکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِس میں ٹُوٹنے والی کوئی چیز نہیں ہے" مسافر نے جواب دیا۔

(شیر نواز گُل، ارمڑ پایان)

ایک صاحِب، جنہیں شیخیاں بگھارنے کی عادت تھی، کسی دعوت میں گئے۔ کھانے کے بعد، عادت کے مُطابِق، کہنے لگے "ہمارا خاندان بہت پُرانا ہے۔ بابر بادشاہ سے لے کر اب تک کا پُورا ریکارڈ ہمارے پاس محفوظ ہے"۔

پھر اُنھوں نے میزبان سے پُوچھا "آپ کا خاندان کتنا پُرانا ہے؟"

میزبان مسکرا کر بولا "کچھ کہہ نہیں سکتا، کیوں کہ ہمارے خاندان کا سارا ریکارڈ طُوفانِ نوحؑ میں بہ گیا تھا"۔

(محمد اِسماعیل سرسانہ، شاہ رُکنِ عالم کالونی نیو ملتان)۔

ایک شخص گھریلُو جھگڑوں سے گھبرا کر ایک ہوٹل میں جا بیٹھا۔ بیرے نے آکر پُوچھا "آپ کو کیا چاہیئے، صاحِب؟"

وہ شخص بولا "ایک پلیٹ تلی ہُوئی مچھلی، اور ہمدردی کے دو بول"۔

تھوڑی دیر بعد بیرے نے مچھلی کی پلیٹ لاکر میز پر رکھی اور پھر اُس شخص کے کان میں کہنے لگا "یہ مچھلی نہ کھانا۔ باسی ہے"۔

(نعمتُ اللہ، ڈیرہ اِسماعیل خان)

کلاس ٹیچر نے بچّوں سے کہا کہ موٹر کار پر ایک مضمون لکھو، جس میں 200 لفظ ہوں۔

ایک بچّے نے مضمون میں لکھا "میرے پاپا نے پچھلے ہفتے ایک کار خریدی، مگر وہ کسی طرح اِسٹارٹ ہی نہیں ہوئی۔

یہ 23 لفظ بنے۔ باقی 177 لفظ وہ ہیں جو میرے پاپا نے کار کی شان میں کہے، اور جنہیں میں اپنے مضمون میں نہیں لِکھ سکتا"۔

(قاسم علی خان، لاہور چھاونی)

مریض نے ڈاکٹر سے کہا "ڈاکٹر صاحِب، مجھے اچانک ہی گھبراہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ پھر دم گھُٹتا ہے۔ ہر چیز بے کیف، بے مزہ لگنے لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے، زِندگی ختم کر لُوں"۔

ڈاکٹر تسلّی دیتے ہُوئے بولا "نہیں، نہیں۔ ایسا نہ کرنا۔ یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں"۔

(ذُوالفقار احمد پرنس، لاہور چھاونی)

ماں بچّوں سے بولی "جو میری بات مانے گا، اور میرے حکم کے آگے چُوں تک نہ کرے گا، اُسے میں اِنعام دُوں گی"۔

سب سے چھوٹا بچّہ بولا "امّی، اِس طرح تو سارا اِنعام ابّو لے جائیں گے"۔

(رانا عباس حیدر، ہِدّھو پورہ)

آپ بھی لکھیے

زندگی کا مقصد

سعدیہ مُشتاق، کراچی Sharjeel Ahmed

آج جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو یہ خیال اُس کے ذہن میں مچلنے لگا کہ میرا اِس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ سارا دن کھا پی لیا، سولیا، پڑھ لیا۔ یہی تو زندگی نہیں۔ آخر کوئی تو مقصد ہونا چاہیے زندگی کا۔

پھر اچانک اُس کا دھیان اپنی کورس کی نظم ابُو بن ادھم (ابراہیم بن ادھم) کی طرف چلا گیا، جس میں کہا گیا تھا کہ خدا اُن سے محبّت کرتا ہے جو اُس کے بندوں سے محبّت کرتے ہیں، اُن کی خدمت کرتے ہیں، اُن کے کام آتے ہیں۔ اُس نے سوچا، شاید زندگی کا مقصد یہی ہے۔ میں خوب پیسے جمع کروں گی اور بڑی ہو کر اچھا سا اِسکول کھولوں گی، جس میں غریبوں کو مُفت تعلیم دی جائے گی۔

پھر اُسے خیال آیا کہ ہم آج تک اپنا گھر تو بنا نہیں سکے، کرائے کے گھر میں رہتے ہیں، اِسکول کیا بنائیں گے۔ اِس کے لیے تو لاکھوں روپے چاہییں۔ پھر اُس نے سوچا اُسے ڈاکٹر بن کر دُکھی اِنسانیت کی خدمت کرنی چاہیے۔ "لیکن مجھے تو سائنس سے دِل چسپی ہی نہیں۔ جب سائنس نہیں پڑھوں گی تو ڈاکٹر کیسے بنوں گی؟" یہ سوچ کر اُس نے ڈاکٹر بننے کا خیال بھی دل سے نکال دیا۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے؟" یہ خیال اُسے بار بار پریشان کر رہا تھا۔ اُس نے سونا چاہا مگر سو نہ سکی۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ میں بڑے بڑے کام تو نہیں کر سکتی۔ ہاں، چھوٹی چھوٹی نیکیاں ضرور کر سکتی ہوں۔ لوگوں کی مدد اِسکول یا ہسپتال کھول کر نہیں، ویسے بھی کی جا سکتی ہے۔ کسی کو سڑک پار کروا دی۔ جو بچّے پڑھائی میں کم زور ہیں، اُن کی مدد کر دی۔ راستے میں پڑا ہوا پتّھر اُٹھا دیا۔ چھوٹی نیکیاں ہی بڑی نیکیوں کی بُنیاد بنتی ہیں۔

اب اُسے اِطمینان ہو گیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خلقِ خدا کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے گی اور ساتھ ہی اپنی پڑھائی پر بھی توجّہ دے گی۔ اُسی وقت اُس کے ذہن میں ایک گانے کے یہ بول گونج اُٹھے:

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

اُس نے آنکھیں مُوند لیں اور پھر جلد ہی نیند کی خوب صورت وادیوں میں کھو گئی۔

(پہلا اِنعام: 50 روپے کی کتابیں)

اِحساسِ ذمّے داری

محمّد ثاقب محمود، باغ بان پورہ لاہور

یہ زیادہ عرصے کی بات نہیں ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک خاندان آکر مُقیم ہوا۔ میاں بیوی اور دو بچّے تھے۔ جلد ہی اِن لوگوں سے ہمارے دوستانہ تعلّقات قائم ہو گئے۔ اُن کی بیٹی ثمرہ 4 سال کی تھی اور بیٹا ارسلان ایک سال کا تھا۔ آنٹی ایک گرلز کالج میں لیکچرار تھیں۔ میں اُن دنوں کانونٹ اِسکول میں چھٹی جماعت کا طالبِ علم تھا۔

ایک دن آنٹی اپنی بیٹی ثمرہ کو ہمارے اِسکول میں داخل

کروانے کے لیے لائیں۔ انہوں نے مجھے کلاس سے بُلوایا اور کہا کہ آج تم اِسے سائیکل پر بٹھا کر گھر لے آنا۔ کل سے میں کسی تانگے یا وین کا بندوبست کرلوں گی۔ انہیں کالج جانے کی جلدی تھی اِس لیے وہ اپنی طرف سے مُطمئِن ہو کر چلی گئیں۔ اِس کے بعد جو کچھ ہُوا میں اُسے کبھی بھول نہ سکوں گا۔

آخری پیریڈ تک تو مجھے یاد تھا کہ ثمرہ کو ساتھ لے کر جانا ہے۔ لیکن جب چُھٹّی کی گھنٹی بجی تو میں اپنے دوستوں کے ساتھ باتوں میں مگن سائیکل لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ ثمرہ مجھے بالکل یاد نہ رہی۔ راستے میں ایک دُکان سے آئس کریم کھائی۔ دس پندرہ مِنٹ اُدھر ضائع ہو گئے۔ گرلز کالج کے قریب سے گزرا تو میری نظر آنٹی پر پڑی جو تیز تیز چلتی ہوئی گھر جا رہی تھیں۔ اُنہیں دیکھتے ہی مجھے ثمرہ یاد آگئی۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔

میں گھبرا کر واپس پلٹا، لیکن قسمت کی خوبی دیکھیے کہ راستے میں سائیکل پنکچر ہو گئی اور میرے پاس پنکچر لگوانے کے لیے پیسے بھی نہیں تھے۔ اب کیا کروں؟ آخر سائیکل گھسیٹتا ہُوا ایک دوست کے گھر گیا، اُسے اپنی پریشانی بتائی اور اُس سے پیسے لے کر پنکچر لگوایا۔ اِس طرح تقریباً 45 مِنٹ اور ضائع ہو گئے۔ گھبراہٹ اور بے چینی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ چُھٹّی ہوئے ایک گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔

میں بھاگم بھاگ اِسکول کے اندر پہنچا۔ مگر وہ خالی ہو چکا تھا۔ جمعدار صفائی کر رہا تھا۔ اُسے اپنی پریشانی بتائی تو وہ میرے ساتھ مِل کر کمروں میں ڈھونڈنے لگا۔ مگر ثمرہ کا کوئی پتا نہ چلا۔ جب ہم دونوں گھر نہ پہنچے تو میری اور ثمرہ کی امّی اِسکول پہنچ گئیں۔ میں گیٹ پر آنکھوں میں آنسو لیے کھڑا تھا۔ آنٹی اور امّی کو سارا واقعہ بتایا۔ ثمرہ کی امّی بے ہوش ہو کر سڑک پر گر گئیں۔ اِردگِرد کے لوگ اِکٹھے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد میرے اور ثمرہ کے ابّو بھی آگئے۔ آنٹی اور انکل کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ہم سب مایُوس ہو کر واپس آگئے۔ پولیس اِسٹیشن میں اِطّلاع دے دی گئی۔

جُوں جُوں وقت گزرتا جا رہا تھا ہماری بے چینی میں اِضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر 5 بجے کے قریب ایک آدمی ثمرہ کو سائیکل پر بٹھا کر گھر لایا۔ اُسے زندہ دیکھ کر اُس کے والِدین خوشی سے پاگل ہو گئے۔ اُنہوں نے ثمرہ کو گلے لگایا اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو اُس آدمی نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے میرے بچّے اِسکول کی دیوار پھاند کر جھولا جُھولنے کے لیے گئے تو سلائڈ کے نیچے یہ بچّی بیٹھی رو رہی تھی۔ بچّے اِس کو گھر لے آئے۔

اُف میرے خدا! ہم نے تو اِسکول کا کونا کونا چھان مارا تھا۔ سلائڈ کے نیچے ہمارا دِھیان ہی نہ گیا تھا۔ وہ شاید دھوپ سے بچنے کے لیے اُس کے نیچے جا کر لیٹ گئی اور پھر سو گئی۔ اُس نیک آدمی نے بچّی ہی سے گھر کا راستہ دریافت کیا اور پھر اُسے لے آیا۔ انکل نے اُس کا بہُت بہُت شکریہ ادا کیا۔ آنٹی کے گھر کی رونق اور بہار تو چند دن کے بعد بحال ہو گئی مگر میں کافی عرصے تک خوف زدہ رہا۔ اِس واقعے سے مجھے یہ سبَق ملا کہ اب میں ہر کام اِنتہائی ذِمّے داری سے کرتا ہوں۔

(دوسرا اِنعام: 45 روپے کی کتابیں)

ایسا بھی ہوتا ہے

مظہر نوید، لاہور

یہ اُن دنوں کا واقِعہ ہے جب ہم پانچویں جماعت کے طالبِ عِلم تھے۔ اُن دنوں ہمیں کہانیاں لکھنے کا بڑا شوق تھا (خیر، وہ تو اب بھی ہے)۔

وہ جُمعے کا دن تھا۔ ہم صبح سے کہانی لکھنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن جناب کبھی امّی کی آواز اور کبھی بھائی جان کی آواز۔ امّی کہتیں کہ لہسن چھیل دو، اور بھائی جان کہتے کہ میرے کپڑے اِستری کر دو۔ اور ہمیں کہانی لکھنے کی جلدی تھی۔ ہمیں غصّہ تو بہُت آ رہا تھا، لیکن کیا کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ غصّہ حرام ہے اور اگر یہ آئے تو اِسے پی

لینا چاہیے۔ اِسی لیے ہم اب تک غصّہ پی رہے تھے۔

ابھی ہم نے کہانی کی دو چار سطریں ہی لکھی تھیں کہ امّی کا چمٹا ہمارے کان پر پڑا، جو ہر بات سُنی اَن سُنی کر دیتا تھا۔ پھر کیا تھا، ہم نے چِلّانا شروع کر دیا "ہائے میرا کان! ہائے میں مر گیا!" لیکن امّی کی ایک ہی ڈانٹ سے مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ اُنھوں نے ہمارا کان پکڑا اور ہمیں گھسیٹتی ہوئی کچن میں لے گئیں اور کہنے لگیں "چلو، جلدی سے لہسن چھیلو"۔ چُوں کہ ہم لڑکے تھے، اِس لیے یہ ہماری شان میں گُستاخی تھی۔ لیکن کیا کرتے۔ اِس کے سِوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ سو ہم لہسن چِھیلنے لگے۔

جب ہم نے لہسن چِھیل لیا تو بھائی جان نے کہا "چلو اب میرے کپڑے اِستری کرو جمعے کی نماز کو دیر ہو رہی ہے"۔

ہم نے کہا "میں کپڑے اِستری نہیں کر سکتا" یہ سُن کر بھائی جان نے ایک عدد تھپّڑ ہمارے گال پر رسید کر دیا، جس سے ہمیں دن میں تارے نظر آ گئے، اور وہ بھی ڈِسکو ڈانس کرتے ہوئے۔ جب ذرا سنبھلے تو جلدی سے کپڑے اِستری کرنے شروع کر دیے۔

ابھی ہم اِستری کر ہی رہے تھے کہ خیال آیا، ہم کاغذ اور قلم تو اُوپر ہی چھوڑ آئے ہیں۔ بھاگے بھاگے چھت پر گئے تو مارے ڈر کے ہمارے مُنہ سے چیخ نکل گئی (ویسے آپس کی بات ہے، ہم ہیں بہت بُزدِل) کیوں کہ چھوٹے میاں نے (جو ہم سے پانچ برس چھوٹے ہیں) اپنے چہرے پر ہمارے قلم سے عجیب و غریب نقش و نگار بنا رکھے تھے اور اُنھوں نے قلم بھی توڑ دیا تھا۔ چُناں چہ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک زور دار تھپّڑ اُن کے گال پر رسید کر دیا۔ اُنھوں نے دہاڑیں مار مار کر سارا گھر بلکہ سارا محلّہ سر پر اُٹھالیا۔

چُوں کہ وہ گھر بھر کے لاڈلے ہیں، اِس لیے اُنہیں خاموش کرانے کے لیے ہم نے عجیب و غریب شکلیں بنانا شروع کر دیں، لیکن وہ خاموش نہ ہوئے۔ اُن کی چیخیں سُن کر دادی امّاں سمیت سارے گھر والے اُوپر آ گئے۔ پھر کیا تھا، ہماری شامت آ گئی۔ بھائی جان الگ ڈانٹ رہے تھے اور دادی امّاں الگ جِھڑک رہی تھیں۔ امّی اور ابّو چھوٹے میاں کو چُپ کرانے میں مصروف تھے۔ ہمارا پچّیس روپے کا قلم ٹوٹ گیا تھا اور اُوپر سے ہم ہی کو جِھڑکیاں پڑ رہی تھیں۔

ہم سر جُھکائے جِھڑکیاں سُن ہی رہے تھے کہ دادی امّاں امّی سے کہنے لگیں "اری بہو، یہ بدبُو کس چیز کی آ رہی ہے؟"

امّی بولیں "لگتا ہے کوئی کپڑا جل رہا ہے"۔

ہمیں ایک دم بھائی جان کے کپڑوں کا خیال آیا۔ بھاگے بھاگے نیچے گئے تو وہاں کچھ اور ہی ماجرا تھا۔ بھائی جان کی شلوار جل گئی تھی۔ لو جناب، پہلے تو 50 فی صد یقین تھا کہ پٹائی ہوگی، اب 100 فی صد یقین ہوگیا۔ ہم شلوار کو گھور گھور کے دیکھ رہے تھے اور سارے گھر والے ہمیں گھور رہے تھے۔ اِس کے بعد نہ پُوچھیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہُوا۔

(تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)

اچھّا دوست

عرفان لطیف، اِسلام آباد

نعیم اور زُبیر کو ساتھ ساتھ اِسکول جاتے ہوئے دو سال ہوگئے تھے۔ لیکن زُبیر نے آج تک کبھی نعیم کو اپنے گھر نہیں بُلایا تھا، کیوں کہ وہ خود اپنی بڑی بہن کے پاس رہتا تھا اور یہ گھر ایسا نہیں تھا کہ وہ فخر سے نعیم کو اِس گھر میں بُلاتا۔

اُس کے بہنوئی بڑھئی تھے اور گھر میں ہی صحن کے ایک کونے میں کام کرتے تھے۔ اِس لیے صحن میں لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے چاروں طرف پھیلے ہوتے۔ اِس کے ساتھ ہی دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جنھیں باجی نے تو خوب سجا رکھا تھا لیکن اُن کا گھر نشیب میں ہونے کی وجہ سے یہ جگہ ہر وقت گیلی گیلی سی محسوس ہوتی تھی اور فضا میں بھی عجیب سی بساند بسی رہتی تھی۔

یہ گھر زُبیر کو پسند نہیں تھا۔ اِس کو دیکھ کر اُسے خوشی کم اور افسوس زیادہ ہوتا تھا۔ اِس کے برعکس نعیم کے گھر کے

آگے جو چھوٹا سا باغ تھا' وہ زبیر کے پورے گھر سے بڑا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ میں نعیم سے دوستی ختم کر دوں۔ بھلا غریب اور امیر کی دوستی بھی کہیں ہوتی ہے۔

لیکن نعیم کی اچھی عادتوں اور خلوص سے مُتاثر ہو کر وہ یہ بات بھول جاتا کہ دونوں کے درمیان کوئی فرق ہے۔ پڑھائی میں بھی دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔

زُبیر کو اپنے غریب ہونے کا جو اِحساس تھا' وہ اب اِحساسِ کم تری بن چُکا تھا۔ ورنہ تعلیم کا شوق تو اُس میں ایک عام لڑکے سے بہت زیادہ تھا۔ اُس کی تعلیم میں دل چسپی ہی اُسے اچھّے نمبر دِلواتی تھی۔ اب اِسکول میں گرمیوں کی چھُٹیاں ہوگئی تھیں۔ زُبیر اپنے گاؤں چلا گیا جہاں اُس کے ماں باپ اور چھوٹی بہن رہتے تھے۔

نعیم پہلے تو ہر دفعہ گرمیوں کی چھُٹیاں گزارنے ملک سے باہر جایا کرتا تھا لیکن اِس دفعہ اُس کے امّی ابّو نے پاکستان کے ایک پُر فضا مقام "کلر کہار" کو چُنا۔

کلر کہار کے ریسٹ ہاؤس میں نعیم اپنے امّی ابّو کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ اِس ریسٹ ہاؤس کے سامنے وہ گاؤں تھا جہاں زُبیر کے والِدین رہتے تھے۔

ریسٹ ہاؤس بہت بلندی پر تھا۔ اُس کی بالکنی میں کھڑے ہو کر نعیم نے جب آس پاس نظر دوڑائی تو اُس کی طبیعت خوش ہو گئی۔ بل کھاتی پگ ڈنڈیاں' ہر طرف لہلہاتے کھیت اور سبزہ' چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں اور خوب صورت چاندی جیسی جھیل اُسے بہت پسند آئی اور وہ اِن نظاروں میں کھو گیا۔

ایک دن شام کو زُبیر کھجور کے خشک پتّے جمع کر رہا تھا کہ اُس کی نظر ریسٹ ہاؤس کی بالکنی پر پڑی جہاں نعیم کھڑا فِطرت کے نظاروں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ زبیر نے اُسے دیکھ لیا مگر خاموشی سے گھر آگیا۔ صحن میں اُس کا معذور باپ چارپائی پر لیٹا آسمان کو گھور رہا تھا۔ اندر کمرے میں اُس کی بہن شازیہ اور ماں کھجور کے خشک پتّوں سے چٹائیاں' ٹوکریاں اور دوسری چیزیں تیّار کر رہی تھیں۔ ماں نے اپنے بیٹے کو پریشان دیکھا تو پوچھا "زُبیر بیٹا' کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟"

جواب میں زُبیر نے اپنے دوست نعیم کے بارے میں اُسے بتایا۔ ماں نے کہا "اِس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟ تم اُسے اپنے گھر لے آؤ۔ مہمان نوازی ہماری رِوایت ہے"۔

"لیکن امّاں' جب نعیم کو یہ پتا چلے گا کہ میں ایک غریب گھرانے سے تعلّق رکھتا ہوں تو وہ مجھ سے دوستی ختم کر دے گا" زُبیر نے اِنتہائی دُکھ سے کہا۔

اُس کی ماں پہلے تو بہت حیران ہوئی پھر اُداسی سے بولی "بیٹا' تم نے تو میری زندگی بھر کی کمائی کو پل بھر میں ختم کر دیا۔ میں نے تو ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ تمھیں کسی قِسم کی کمی محسوس نہ ہو" یہ کہتے ہوئے ماں کی آنکھوں سے آنسُو آگئے۔

زُبیر پریشان ہو کر بولا "امّاں' میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔ میں اِس لیے پریشان ہوں کہ کہیں میرا دوست نعیم مجھے اِس گھر میں دیکھ کر میرا مذاق نہ اُڑائے"۔

ماں اِطمینان سے بولی "بیٹا' تم فِکر نہ کرو۔ ایسا کوئی ڈر اپنے دل میں نہ لاؤ۔ اگر تمھارا دل مُطمئِن ہے تو کچھ نہیں ہو گا۔ تم بِالکُل بے فِکر ہو جاؤ اور اپنے دوست کو یہاں لے آؤ۔ جاؤ"۔

امّاں کی باتوں نے زُبیر کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ نعیم کو اپنے گھر لے آیا۔ نعیم اُس کے ماں باپ سے مِل کر بہت خوش ہوا اور اُس کی آنکھوں میں خُلوص کی چمک دیکھ کر زُبیر کا اِحساسِ کم تری جاتا رہا۔

(چوتھا اِنعام: 35 روپے کی کتابیں)

نیکی کا بدلہ

وجیہہ کنول' لاہور

پچھلے سال میں اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک عزیزہ کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی گئی۔ ہمارا پروگرام تھا کہ شادی سے فارغ ہو کر خوب سیر کریں گے۔

چناں چہ شادی کے اگلے دن ہم لوگ سیر کے لیے کلفٹن گئے۔ وہاں ہمیں بہت مزہ آیا۔ ہم نے خوب جھولا جھولا اور طرح طرح کی چیزیں کھائیں۔

جب ہم کلفٹن سے واپس آنے لگے تو اچانک میری نظر ایک بڑھیا پر پڑی، جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی امی سے کچھ روپے لے کر اُسے دے دیے۔ اُس نے مجھے دُعا دی کہ خدا انہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔

راستے میں اچانک ہماری کار پنکچر ہو گئی۔ میرے ابو اور انکل ٹائر بدلنے لگے۔ میں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کزن سے باتیں کر رہی تھی کہ اچانک ایک تیز رفتار گاڑی بالکل ہمارے قریب سے فراٹے بھرتی ہوئی گزر گئی۔ اگر میری کزن مجھے فوراً ہی پیچھے نہ کھینچ لیتی تو وہ گاڑی مجھے کچل کر رکھ دیتی۔ جب میرے حواس بجا ہوئے تو کار کا ٹائر لگ چکا تھا۔ ہم گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں میں سوچ رہی تھی کہ اُس بڑھیا کی دُعا کی وجہ سے میری جان بچ گئی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور ہم خیریت کے ساتھ گھر واپس آ گئے۔ (پانچواں انعام: 30 روپے کی کتابیں) (وجیہہ کنول اپنا پورا پتا لکھ کر بھیجیں)

چھوٹی خوشی

جاوید اقبال، اٹک شہر

آج ہمارے اسکول میں یومِ والدین منایا جا رہا تھا۔ سارے اسکول کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا اور جگہ جگہ خوب صورت بینر آویزاں کیے گئے تھے۔ ہم سب دوست اسکول کے باغیچے میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔

"بھئی علی، ایک بات تو بتاؤ؟" میں نے علی سے پوچھا۔

"ایک چھوڑ چار پوچھو" علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے کبھی کسی بے وقوف کو دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے یوں مجھے گھور کر دیکھا جیسے خدا ناخواستہ میرے سر پر سینگ اُگ آئے ہوں۔ پھر پوچھا "کیا مطلب؟"

"مطلب پوچھنے سے پہلے ذرا اُدھر دیکھو" میں نے نعیم کی طرف اشارہ کیا جو کچھ فاصلے پر اکیلا بیٹھا تھا۔ علی سمیت سارے دوستوں نے اُدھر دیکھا اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ہمارے قہقہوں کی آواز سن کر نعیم وہاں سے اُٹھ کر دوسری طرف چلا گیا۔ لیکن جاتے ہوئے جب اُس نے ہماری طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ہیلو نعیم، کیسے ہو؟" میں نے نعیم سے اُس وقت پوچھا جب وہ کینٹین سے دال خرید رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"شاید تم ہماری باتوں سے ناراض ہو گئے ہو۔ دیکھو دوست، آج یومِ والدین ہے، اور تم پریشان بیٹھے تھے۔ اِسی وجہ سے ہم اپنے قہقہے ضبط نہ کر سکے" میں نے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے، جاوید۔ ہنسی مذاق تو چلتا ہی رہتا ہے۔ میں تو ویسے ہی پریشان ہوں" اُس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اور پریشانی کی وجہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولا:

"تمہارے ابو امی یومِ والدین کے جلسے میں شرکت کریں گے؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔ کریں گے" میں نے جواب دیا۔

"مگر میرے ابو اور امی میں سے کوئی بھی اسکول نہیں آئے گا۔ کل جب میں نے اُن سے بات کی تو ابو بولے کہ انہیں تو بزنس کے سلسلے میں کہیں جانا ہے۔ اور امی بولیں کہ مجھے ایک پارٹی اٹینڈ کرنی ہے۔ ذرا سوچو تو وہ میری خاطر اپنی پارٹیاں ملتوی نہیں کر سکتے۔ انہیں مجھ سے کیا خاک پیار ہے؟" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور میں سوچتا رہ گیا کہ یہ کیسے والدین ہیں جو اپنے بچوں کو ایک چھوٹی سی خوشی بھی نہیں دے سکتے؟

(چھٹا انعام: 25 روپے کی کتابیں)

موت کی دیوار

سلیم خان گمی

Sharjeel Ahmed

اُن دونوں نے آدھا پہاڑ طے کر لیا تھا لیکن کیپٹن بلونت سنگھ نےابھی تک صُوبے دار اسلم کو ہلاک نہیں کیا تھا۔

صُوبے دار اسلم کیپٹن بلونت سنگھ کے سر کے اوپر تھا اور پیر رکھنے کے لیے پتھریلی دیوار میں جگہ بنا رہا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے تیشے سے برف کاٹ رہا تھا جو بلونت سنگھ کے قریب آکر گرتی اور نیچے لُڑھکتی چلی جاتی۔ وہ دو دو فٹ کے فاصلے پر نِصف بُوٹ کے برابر رخنہ بنا رہا تھا تاکہ اُوپر چڑھنے میں آسانی رہے۔ وہ یہ کام تیزی سے کر رہا تھا جیسے عام طور پر پیشہ ور گائڈ کیا کرتے ہیں۔ وہ کوہ پیماؤں کا گائڈ تھا اور پچھلے دس سال سے امریکا، برطانیہ، اِٹلی، جاپان اور بھارت سے آنے والے کوہ پیماؤں کی راہ نُمائی کر رہا تھا۔

کیپٹن بلونت سنگھ نے اُوپر دیکھا۔ صُوبے دار اسلم اپنے کام میں مگن تھا اور اُس کے اُوپر نانگا پربت کی خوف ناک چٹانیں تھیں، جن پر برف یُوں جمی تھی جیسے چڑیلوں نے سفید چادریں اوڑھ لی ہوں۔ ہوا تیز ہوگئی تھی جس سے چند پتّھر اُن کے قریب سے لُڑھکتے ہوئے نیچے گرے۔ لیکن برف پر گرنے سے شور زیادہ نہ ہُوا۔

"ہوا تیز ہوگئی ہے" بلونت سنگھ نے چیخ کر کہا۔

"اِسے کون روک سکتا ہے؟" صوبے دار اسلم نے جواب دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ طوفان آنے سے پہلے پہلے اُوپر پہنچ کر محفوظ جگہ تلاش کرلے۔

"ہوا طوفان کی شکل اِختیار کر رہی ہے" بلونت سنگھ بولا "ہزاروں ٹن برف اور پتھر ہم پر گرنے والے ہیں"۔

"بے شک۔ لیکن ہم اُن سے بچنے کی تدبیر کر رہے ہیں"۔ صوبیدار نے کہا۔

کیپٹن بلونت سنگھ نے سوچا، اگر طوفان نے آلیا تو کم از

کم اُسے یہ خوشی تو ہوگی کہ اُس کے ساتھ صوبے دار بھی نیچے گر کر موت کا نوالہ بن گیا۔ تاہم وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صوبے دار اسلم کو ہلاک کرنے سے پہلے اُسے یہ بتائے کہ وہ کون ہے اور اُسے کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے۔

پیر رکھنے کے لیے رخنے بن چکے تھے اور کیپٹن بلونت سِنگھ صُوبے دار اسلم کے پیچھے پیچھے اُوپر چڑھ رہا تھا' آہستہ آہستہ۔

"میں نے اِتنی دیر کیوں کی؟" اُس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"یہ تمہاری بے وقوفی ہے" اُس کے دل نے جواب دیا۔

"ہم دونوں صبح سے اُوپر چڑھ رہے ہیں۔ وہ اُوپر اور میں نیچے۔ میں نیچے سے وار کر کے اُسے ہلاک کر سکتا تھا" اُس نے کہا۔

"اِس میں کیا شک ہے۔ میں پھر کہوں گا تم بے وقوف ہو" اُس کا دل بولا۔

"دراصل میں اسلم کی مہارت سے مُتاثّر ہوگیا تھا۔ وہ کتنے شان دار اور ماہرانہ طریقے سے کوہ پیمائی کی ہر مشکل کو حل کرتا رہا ہے" کیپٹن بلونت سِنگھ بولا۔

"کوہ پیمائی کے بہت بڑے ماہر تو تم بھی ہو" اُس کے دِل نے اُسے بتایا۔

"لیکن اِتنا بڑا نہیں جتنا بڑا صُوبے دار اسلم ہے"۔

اُوپر صوبے دار چلا رہا تھا۔ لیکن تیز ہوا کے شور سے بلونت سِنگھ کچھ نہ سُن پایا۔ البتہ اسلم نے جب تیشہ اُٹھا کر اپنے سر کے اُوپر اِشارہ کیا تو وہ اُس کی بات سمجھ گیا۔ کوئی ایک ہزار فٹ اُوپر چھجّے کی طرح ایک پتھریلی چٹان تھی۔ اسلم اُس کی طرف اِشارہ کر رہا تھا کہ اُس چھجّا نُما چٹان کے نیچے پہنچ کر وہ برف کے طوفان سے بچ سکتے ہیں۔ وہ دونوں تیزی سے اُوپر چڑھنے لگے۔

جب وہ اس چھجّے کے نیچے پہنچے تو برف کا طوفان تیز ہوگیا۔ یہ دراصل ہوا کا طوفان تھا جو برف اور چھوٹے چھوٹے پتھّروں کو اُڑا رہا تھا۔ ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اُس کی رفتار کبھی کم نہ ہوگی۔ وہ دونوں چھجّے کے نیچے بیٹھ گئے۔ شام ہو رہی تھی' لیکن برفانی طوفان نے شام کو رات میں بدل دیا تھا۔ سفید برف نیلی دکھائی دے رہی تھی۔ چناں چہ اُن کے اِردگِرد کا سارا ماحول نیلگوں تھا جو رات کی آمد کی وجہ سے سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ بلونت سِنگھ نے سوچا' نانگا پربت واقعی خطرناک پہاڑ ہے۔ اِسی لیے اِسے "قاتِل پہاڑ" کہا جاتا ہے' یعنی کوہ پیماؤں کو ہلاک کرنے والا پہاڑ۔

"اب ہم یہاں محفوظ ہیں" صُوبے دار اسلم نے کہا اور ہنسنے لگا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا "مجھے آپ کا گائڈ بن کر بہت خوشی ہوئی ہے' کیوں کہ آپ بھارت کے مشہور کوہ پیما ہیں۔ مجھے اُس وقت بہت اُلجھن ہوتی ہے جب میرا واسطہ اناڑی کوہ پیماؤں سے پڑتا ہے۔ اُن سے نمٹنا بہت مشکل ہے۔ وہ بات نہیں سمجھ پاتے۔ آپ تو ماشاء اللہ پیشہ ور کوہ پیما ہیں"۔

کیپٹن بلونت سِنگھ مسکرایا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صُوبے دار اسلم کی بات تسلیم کرتا ہے۔ پھر اُس نے صوبے دار کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ پتھّر کی طرح سخت' مضبوط اور کھردُرا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی چٹان سے تراشا گیا ہے۔ یہ چہرہ پچھلے بارہ سال میں ذرا بھی تبدیل نہیں ہُوا تھا۔ بارہ سال پہلے اُس نے یہ چہرہ پاکستانی شہر شکرگڑھ کے جنگی کیمپ میں پہلی بار دیکھا تھا' جہاں وہ جنگی قیدی کی حیثیت سے قید تھا اور کیمپ میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اِسی کیمپ میں صُوبے دار اسلم نے اُس کے بہت ہی پیارے دوست دھرم وِیر کو ہلاک کیا تھا!

کیپٹن بلونت سِنگھ وہ شام کبھی نہ بُھلا سکا جب دھرم وِیر کو ہلاک کیا گیا تھا۔ جب بھی اُسے دھرم وِیر کی یاد آتی' اُسے محسوس ہوتا اُس کی موت کا واقعہ ابھی ابھی اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔

1971ء کی جنگ میں بھارت نے پاکستان کی تحصیل شکرگڑھ پر حملہ کر کے کئی دیہات پر قبضہ کرلیا تھا۔ لیکن لڑائی کے دوران میں بھارتی فوج کے کئی جوان اور افسر پاکستانی فوج نے پکڑ لیے تھے اور اُن کو شکرگڑھ کے جنگی

کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ ایک دن کچھ قیدی بھاگ نکلے۔ اسلم ڈیوٹی پر تھا۔ اُس نے اپنے جوانوں کو لے کر اُن کا پیچھا کیا۔ تمام قیدی پکڑ لیے گئے لیکن صوبے دار دھرم ویر بھاگ گیا۔

ڈیوٹی گارڈ دھرم وِیر کو تلاش کرتے رہے تھے، لیکن وہ اُن کے ہاتھ نہ آیا تھا۔ آخر صوبے دار اسلم نے جیپ لی اور موضع فتح پور افغاناں میں اُسے جالیا۔ اور جب وہ بھاگنے لگا تو اُسے گولی مار دی۔ پھر اُس کی لاش جیپ میں ڈالی اور اُسے جنگی کیمپ میں لے آیا۔

"دھرم ویر اکیلا تھا، اور اُس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہ تھا۔ تم نے اُسے گولی کیوں ماری؟" کیپٹن بلونت سِنگھ نے اُس روز صوبے دار اسلم سے کہا تھا۔

"وہ بھاگنا چاہتا تھا۔ اِس لیے مجھے گولی چلانا پڑی" صوبے دار نے جواب میں کہا تھا۔

"اگر ہم دونوں اِس لڑائی میں زندہ بچ گئے تو میں تمھیں تلاش کر کے گولی کا نشانہ بناؤں گا" کیپٹن بلونت نے کہا تھا۔

اسلم نے چند سیکنڈ بلونت سِنگھ کو گھور کر دیکھا تھا، کچھ سوچا تھا اور پھر چل دیا تھا۔

16 دسمبر 1971 کو پاک بھارت جنگ ختم ہوگئی، اور کچھ عرصے بعد بلونت سِنگھ اور محمّد اسلم فوج سے ریٹائر ہوگئے۔ لیکن بلونت سنگھ دھرم وِیر کی ہلاکت کو نہ بُھولا تھا۔ وہ 1971ء کے بعد کوہ پیما کی حیثیّت سے دوبار پاکستان آیا اور محمّد اسلم کو تلاش کرنے کے لیے بلوچستان تک گیا، کیوں کہ محمّد اسلم بلوچ تھا۔ لیکن اسلم اسے نہ کوئٹے میں ملا اور نہ چاغی میں۔ ہاں، اُسے یہ پتا چلا کہ اُس نے کچھ دنوں کوئٹے میں ٹھیکے داری کی تھی اور پھر نہ معلوم کہاں چلا گیا۔

اب کیپٹن بلونت سِنگھ تیسری بار پاکستان آیا تھا اور اِس بار وہ نانگا پربت کی چوٹی سر کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اِس کام کے لیے کسی ماہر گائڈ کی ضرورت تھی اور ایسا ماہر گائڈ صرف سکردو میں مِل سکتا تھا کیوں کہ سکردو گائڈوں اور قلیوں کا بہترین مرکز ہے۔

کیپٹن بلونت سکردو کے ایک ہوٹل میں داخل ہُوا اور کاؤنٹر بوائے سے کہا کہ وہ ایک ایسے گائڈ کی تلاش میں ہے جو بُہت ماہر اور دِلیر ہو۔ ہوٹل کا بیرا اُسے ایک ایسی میز پر لے گیا جہاں اسلم بیٹھا نمکین چائے پی رہا تھا۔ بلونت سِنگھ نے اُسے دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسلم نے اُٹھ کر مُصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، اُس نے کیپٹن بلونت سِنگھ سے اُس کا نام پوچھا اور پھر اُس کے لیے نمکین چائے کا آرڈر دیا۔ بلونت سنگھ نے محسوس کیا کہ اسلم نے اُسے پہچانا نہیں۔

اگلے دن بلونت سنگھ نے صوبے دار اسلم کو گائڈ کے طور پر بُک کرلیا اور پھر دونوں نانگا پربت کی چوٹی سر کرنے کے لیے اِنتظامات میں مصروف ہوگئے۔ اُنھوں نے کچھ دن سکردو اور گلِگت میں گزارے اور پھر نانگا پربت کو مشرق کی سَمت سے فتح کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔

ہر بات بلونت سِنگھ کی مرضی کے مُطابِق ہُوئی۔ وہ خود ایک ماہر کوہ پیما تھا اور اسلم کو اُس پر کوئی شبہ بھی نہ تھا۔ بلونت سنگھ اب اُسے آسانی سے ہلاک کر سکتا تھا۔ کوہ پیمائی کے دوران میں اُسے دھکا دیا جا سکتا تھا یا کسی ہتھیار سے قتل کیا جا سکتا تھا۔ تاہم اب بلونت سنگھ کو افسوس ہو رہا تھا کہ ایک پورا دن ضائع ہوگیا تھا اور وہ اپنے دوست دھرم ویر کا بدلہ نہ لے سکا تھا۔

"لیجیے، چائے پیجیے" اسلم نے گرما گرم نمکین چائے کپ میں ڈال کر بلونت سنگھ کو پیش کی۔ بلونت نے کپ پکڑ لیا۔

"گرم ہے۔ سردی سے بچنے میں مدد ملے گی" اسلم بولا۔

بلونت سنگھ نے جلدی جلدی چائے پی جس سے اُس کے جسم میں حرارت دوڑ گئی۔ وہ کپ اسلم کو دیتے ہوئے بولا "اسلم، مجھے ایک بات بتاؤ"۔

"پُوچھیے؟"

"تم تو بلوچ ہو اور بلوچستان کے رہنے والے ہو۔ پھر

بلتستان میں کیسے آگئے؟"

"میں بلوچستان میں خوش نہیں تھا" اسلم بولا "میرے قبیلے کے اندر بھی کئی چھوٹے چھوٹے قبیلے ہیں، جن کو ہم پاڑے کہتے ہیں- وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں- اور پھر میرے اپنے مری قبیلے کے جھگڑے بھی دوسرے قبیلوں سے تھے- میں اِن فضول لڑائی جھگڑوں سے تنگ آگیا اور سکردو میں آکر رہنے لگا"۔

اسلم کچھ دیر خاموش رہا، پھر اُس نے اپنے تھیلے میں سے چکن سینڈوچ نکالے اور بلونت سِنگھ کو دیتے ہوئے بولا-

"ہمیں کچھ کھانا چاہئے۔ رات ہوگئی ہے- ڈنر ٹائم- اِس کے بعد سو جائیں گے- یہاں ہم سردی سے بچ سکتے ہیں- کم از کم ہمیں نمونیہ نہیں ہوگا"۔

وہ خاموشی سے چکن سینڈوچ کھاتے اور تھرماس سے نمکین چائے پیتے رہے- چاروں طرف گھٹاٹوپ اندھیرا تھا، ہوا شور مچا رہی تھی اور برف ہوا کے سنگ اُڑ اُڑ کر اِدھر اُدھر گر رہی تھی-

"آج کی رات بہت خراب رات ہوگی- میرا مطلب ہے، بہت تکلیف دِہ" بلونت سِنگھ بولا-

"گھبرانے کی ضرورت نہیں- ہم کل صبح تک زندہ رہیں گے" اسلم نے کہا-

یہ کہہ کر اُس نے بلونت سِنگھ کے کندھے کو تھپ تھپایا اور پھر بولا "اب آپ اپنے سلیپنگ بیگ میں گھُس جائیں، اور کوشش کریں کہ نیند آجائے"۔

بلونت سِنگھ نے اسلم کی طرف دیکھا- وہی پتھریلا چہرہ تھا لیکن آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی- اُس نے سوچا، کیا اسلم کو پتا چل گیا ہے کہ میں کون ہوں اور کِس غرض سے یہاں آیا ہوں- اگر یہ بات ہے تو اُس کی کوشش ہوگی کہ وہ میرا مُقابلہ کرے- اور اِس مُقابلہ کے دوران میں وہ خود بھی مر سکتا ہے اور مجھے بھی مار سکتا ہے- یہ سوچتے ہوئے اُس نے سلیپنگ بیگ چٹان کے ساتھ رکھا اور اُس کے اندر گھُس گیا- تھوڑی دیر بعد ہوا کی لوری نے اُسے گہری نیند

سُلا دیا۔
جب دوسرے دن بلونت سنگھ جاگا تو طوفان تھم گیا تھا۔ سورج نکل آیا تھا اور سلیپنگ بیگ پر گری ہوئی برف پگھل رہی تھی۔ وہ دونوں بسکٹ چبانے اور چائے پینے لگے۔

صوبے دار اسلم نے کہا "میں اِس پہاڑ کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ میری نظر میں چند دُشواریاں ہیں۔ ہمارے اُوپر جو چٹان ہے، اُس کے اُوپر برف گری ہے اور وہاں ایک دیوار سی بن گئی ہے جس کو پار کرنا مشکل ہو گا۔ تازہ اور نرم برف کی وجہ سے اُس میں میخیں ٹھونکنا خطرناک ہو گا۔ میخیں اُکھڑ سکتی ہیں"۔

پھر اُس نے دُور وادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر آپ واپس جانا چاہتے ہیں تو ابھی فیصلہ کر لیں۔ اِس کے بعد مشکل ہو گا"۔

بلونت سنگھ نے اسلم کی بات پر زیادہ توجّہ نہ دی۔ وہ بولا "تم چڑھائی کب شروع کرو گے؟"

"جتنی جلدی ممکن ہُوا" اسلم نے کہا۔

"تو چلو پھر، شروع کرتے ہیں" بلونت سنگھ بولا۔ دونوں نے اپنا اپنا سامان پیک کیا اور چڑھائی شروع کر دی۔ اب اُن کا سامنا برف کی دیوار سے تھا۔ یہ بہت تکلیف دِہ اور صبر آزما کام تھا۔ اسلم آگے تھا اور بلونت پیچھے۔ اسلم میخیں ٹھونک رہا تھا۔ وہ تین گھنٹے تک آگے بڑھتے رہے اور اب برف کی دیوار کے سامنے تھے، بالکل سامنے۔

بلونت سنگھ برف کی دیوار کو دیکھ کر بولا "کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ ہم اِس دیوار کو کسی اور طریقے سے پار کریں؟"

"اگر ہم واپس جائیں اور پھر دائیں جانب جا کر آگے بڑھیں تو برف کی دیوار کے اُوپر آسانی سے جا سکتے ہیں" اسلم نے بتایا۔

"لیکن ایسا کام تو اناڑی کوہ پیما کرتے ہیں"۔

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ ہم برف کی دیوار عبور کریں گے"۔

اسلم نے کہا اور میخ ٹھونکنے لگا۔ بلونت سنگھ نے محسوس کیا کہ اسلم اُسے جان بُوجھ کر برف کی دیوار کے اُوپر لے جانا چاہتا ہے تاکہ موقع پا کر اُسے ہلاک کر سکے۔ اُسے اب یقین ہو گیا تھا کہ اسلم پوری طرح جان گیا ہے کہ وہ کون ہے۔ اب اِنتظار کا موقع نہ تھا۔

اسلم آگے تھا اور بلونت سنگھ پیچھے۔ دونوں کے درمیان پانچ فُٹ کا فاصلہ تھا۔ اسلم کی کمر میں جو رسّا بندھا ہُوا تھا اُس کا دُوسرا سِرا بلونت کی کمر میں بندھا تھا۔ اسلم میخیں ٹھونکتا جاتا، اور وہ دونوں اُن میخوں پر پاؤں رکھتے ہوئے اُوپر چڑھتے جاتے۔

اب برف کی دیوار ختم ہونے کو تھی۔ اسلم نے اُوپر ہاتھ اُٹھائے تاکہ میخ پکڑ سکے، لیکن میخ اُس کے ہاتھ میں نہ آئی۔ اُس نے اپنا سارا بوجھ نیچے کی میخ پر ڈال دیا۔ بلونت سنگھ نے دیکھا کہ اسلم کے جسم کے بوجھ سے میخ جُھک گئی ہے۔ اُس نے اسلم کو پُکارا لیکن دیر ہو گئی۔ اسلم لُڑھکا اور نیچے خلا میں لٹک گیا، بلونت سنگھ سے پانچ فٹ نیچے!

اسلم اب بلونت سنگھ کے رحم و کرم پر تھا۔ اُس کے جسم کے سارے بوجھ کو اُس رسّے نے اُٹھا رکھا تھا جو بلونت سنگھ کی کمر میں بندھا تھا۔ تب بلونت سنگھ نے اسلم کی آواز سُنی:

"کیپٹن بلونت سنگھ! اب کس بات کا اِنتظار ہے؟"

بلونت سنگھ نے سوچا، موقع اچّھا ہے۔ چاقو سے رسّا کاٹ دو۔ اسلم نیچے گِر کر ہلاک ہو جائے گا۔ یہی وہ موقع تھا جس کا اُس نے بارہ برس اِنتظار کیا تھا۔

"ہچکچا کیوں رہے ہو؟ کاٹو رسّا" اسلم نے چیخ کر کہا۔

بلونت سنگھ نے لمحہ بھر سوچا۔ یہ لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔ اُس کے دل نے کہا "کسی بے بس اِنسان کو ہلاک کرنا مردانگی نہیں ہے"۔

"میں پہلے چوٹی پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ پھر کچھ کروں گا" بلونت سنگھ نے یہ کہہ کر اُوپر کی میخ کو دائیں ہاتھ سے پکڑا، نیچے کی میخ پر پاؤں جمایا اور پھر بائیں ہاتھ سے رسّی کو جھٹکا

ے کر اسلم کو چٹان کے قریب لے آیا۔ اسلم نے جھٹ چٹان میں گڑی ہوئی ایک میخ کو پکڑ لیا۔

وہ دونوں دیوار پار کر کے چٹان پر پہنچے تو اسلم بولا "مُجھ سے غلطی ہوئی' اِس لیے میں گر پڑا"۔

وہ دونوں کچھ دیر چٹان پر کھڑے رہے' پھر اسلم نے بلونت سِنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "آپ مجھے مارنا چاہتے تھے۔ مارا کیوں نہیں؟"

بلونت سنگھ بولا "میں واقعی تُمھیں قتل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں کسی کو اِتنی آسانی سے قتل نہیں کر سکتا جِس طرح تم کر سکتے ہو"۔

صُوبے دار اسلم نے کہا "ایک بات کا آپ کو پتا نہیں۔ آپ کا دوست دھرم دیر بھاگتا ہُوا ایک کسان کے گھر میں گھُس گیا تھا۔ جب میں اُس گھر میں داخل ہُوا تو وہ کسان کا بیلچہ اُٹھا کر میری طرف لپکا۔ اگر میں گولی نہ چلاتا تو وہ مجھے مار دیتا"۔

"تم نے مجھے اُس وقت یہ بات کیوں نہیں بتائی؟" بلونت سِنگھ نے پوچھا۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک جنگی قیدی کو اپنے ایکشن کی وجہ بتاؤں" اسلم نے کہا "لیکن اب میں چاہتا ہُوں کہ آپ میری بات کا یقین کریں"۔

"مجھے یقین ہے۔ اگر تمھاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی وہی کچھ کرتا جو تم نے کیا" بلونت سِنگھ بولا۔

بلا عنوان

اِس کارٹون کا عنوان لکھیے
اور 200 روپے کے انعامات حاصل کیجیے۔ آخری تاریخ 12 مئی 1994ء

★ اپریل 1994ء کے کارٹون کے بے شمار ساتھیوں نے عنوان تجویز کیے، جن میں سے مُندرجہ ذیل عنوان ججوں کو پسند آئے:

(1) "یہ ہے کپڑے سکھانے کا صحیح طریقہ"۔ یہ عُنوان اِن ساتھیوں نے تجویز کیا: ثُمیرا حمید علامہ اِقبال ٹاؤن لاہور۔ نُور افشاں ملک گلبرگ 3 لاہور۔ غُلام بِلال فیصل آباد۔ غُلام اویس فیصل آباد۔ محمّد اکرم مُغل گکھڑ منڈی۔ خُرم اکرام وحدت روڈ لاہور۔ حُمیرا کرن نواں کوٹ لاہور۔ کنول سجّاد پشاور چھاؤنی۔ جمشید احمد ریواز گارڈن لاہور۔ فرحان حبیب سیٹلائٹ ٹاؤن راول پنڈی۔ محمّد عاطِف برانڈرتھ روڈ لاہور۔ راجا اِمتیاز حُسین حامد ٹاؤن راول پنڈی۔ عبدالعزیز چشتی ڈھینگرانوالی۔ آصف سلیمان ہری پور۔ محمّد ثاقب آغا (پتا نہیں لکھا) اِن میں سے شروع کے 7 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی 20،20 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔

(2) "ایک پنتھ دو کاج"۔ یہ عنوان 1500 ساتھیوں نے تجویز کیا۔ اِن میں سے اِن چار ساتھیوں کو' بذریعہ قُرعہ اندازی' 15،15 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں: لائقہ شفیق بی بی پاک دامن لاہور۔ ارحم نعیم ماڈل ٹاؤن سیال کوٹ۔ مرزا نوازِش اِلٰہی ڈیفنس لاہور۔ اویس حیدر جھنگ بازار فیصل آباد۔

Sharjeel Ahmed

جب ہم قیامِ پاکستان کا ذکر کرتے ہیں تو قائداعظمؒ کے بعد جو نام ہمارے ذہنوں میں ابھر کر سامنے آتا ہے وہ علامہ اقبالؒ کا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی سلطنت کے قیام کا تصور سب سے پہلے علامہ اقبالؒ نے ہی پیش کیا تھا جسے قائداعظمؒ جیسے مردِ مجاہد نے اپنی دلی لگن اور اَن تھک جدوجہد کے نتیجے میں حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔

علامہ اقبالؒ سیالکوٹ کے ایک معمولی گھرانے میں 9 نومبر 1877ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ بزرگوار کا نام شیخ نور محمد تھا۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہی حاصل کی۔ 1882ء میں ایک مشن اسکول میں داخل ہوئے۔ 1893ء میں میٹرک پاس کیا اور وہاں کی مشہور درس گاہ "مرے کالج" میں داخل ہوگئے۔ وہاں عربی فارسی میں آپ کے استاد مولوی سید میر حسن تھے جنہوں نے آپ کو ان دونوں زبانوں کے ادب کا دلدادہ بنا دیا۔ آپ تمام عمر اپنے اس محترم استاد کی دل سے عزت کرتے رہے۔ اپنی ایک نظم میں بھی اپنے اس استاد کا ذکر بڑے عزت و احترام سے کیا ہے۔ یہاں تک کہ جب انگریز حکومت نے 1922ء میں آپ کو علمی و ادبی خدمات کے صلے میں 'سر' کا خطاب دینا چاہا تو آپ نے اصرار کیا کہ انہیں خطاب دینے سے پہلے ان کے استاد سید میر حسن کو خطاب دیا جائے۔ چناں چہ حکومت نے آپ کے استادِ محترم کو بھی شمس العلماء کا خطاب دیا۔ کسی آدمی کا احسان نہ بھولنا اور عمر بھر اپنے استاد کی دل سے عزت کرتے رہنا ایک بڑے آدمی کی بڑائی کی نشانی ہے۔

آپ نے 1895ء میں مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے پاس کرنے کے بعد لاہور آکر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ 1897ء میں بی اے پاس کیا جس میں انگریزی اور عربی میں اول آنے پر طلائی تمغے حاصل کیے۔ 1899ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم اے پاس کیا اور تمام یونیورسٹی میں اول آنے پر طلائی تمغہ حاصل کیا۔ 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گئے اور وہاں کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ 1907ء میں فارسی ادب پر مقالہ لکھا جس پر جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1908ء میں لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وطن واپس آئے تو الٰہ آباد اور علی گڑھ یونیورسٹیوں نے بھی اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دیں۔ [redacted] میں اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے استاد مقرر ہوگئے اور 1903ء میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1908ء میں وکالت شروع کی، ساتھ ہی سیاست میں حصہ لینا بھی شروع کر دیا۔ 1930ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں ہندوستان میں ایک آزاد مسلم

باقی صفحہ 56 پر

R. L. No. 4756 **The Taleem-o-Tarbiat, Lahore**

PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 12.00

Sharjeel Ahmed

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE

FEROZSONS EDUCATIONAL

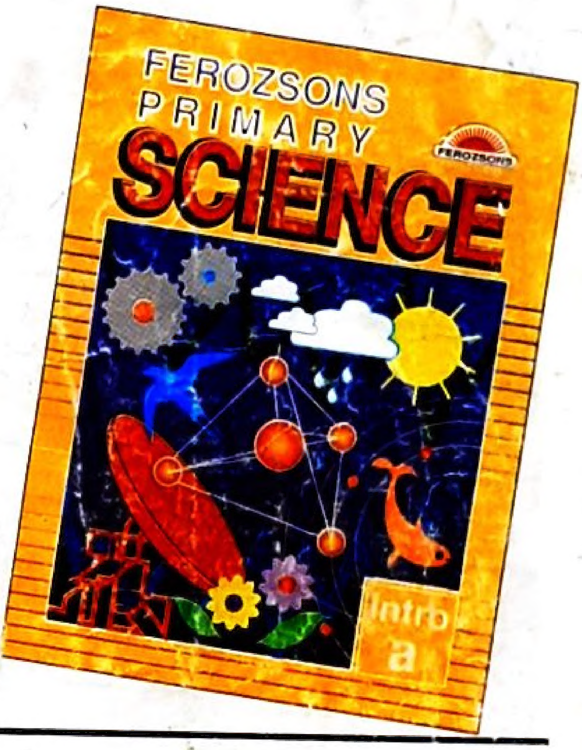

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE is a complete series of twelve systematically graded books, well suited to the educational needs of children in English Medium Schools worldwide.
The aim of this series is to present the fundamentals of science in a way which children can easily understand and assimilate. They will not only remember the facts but also remember that the learning of them was a joyful experience.
Each book is divided into a number of parts which cover the main areas of study and are colour-coded for easy reference.
All the books are richly illustrated in colour and each drawing has been specially chosen to complement and support the text.
Each book commences with an interest-stimulating quiz and ends with an extra-curricular exercise entitled 'Do You Know?'

Intro a — 969 0 10141 2 — Rs. 35.00
Part 1 **Human beings**
Part 2 **Healthcare and safety**
Part 3 **Living and non-living things**
Part 4 **Animals**
Part 5 **Objects**

1a — 969 0 10092 0 — Rs. 40.00
Part 1 **Human beings**
Part 2 **Things around us**
Part 3 **Living and non-living things**
Part 4 **Animals**
Part 5 **Animals and their babies**

2a — 969 0 10094 7 — Rs. 40.00
Part 1 **Human beings**
Part 2 **Health and safety**
Part 3 **Animals**
Part 4 **More about animals**
Part 5 **Sound**
Part 6 **Magnetism**

Intro b — 969 0 10142 0 — Rs. 35.00
Part 1 **Plants**
Part 2 **Food**
Part 3 **Light and Heat**
Part 4 **Movement**
Part 5 **Distance**
Part 6 **Earth and Sky**
Part 7 **Time**

1b — 969 0 10093 9 — Rs. 40.00
Part 1 **Objects**
Part 2 **Plants**
Part 3 **Force and machines**
Part 4 **Energy**
Part 5 **Sound**
Part 6 **Magnetism**
Part 7 **Heat and temperature**
Part 8 **Light and shadow**
Part 9 **Time**

2b — 969 0 10095 5 — Rs. 40.00
Part 1 **Colours**
Part 2 **Plants**
Part 3 **Force and machines**
Part 4 **Energy**
Part 5 **Electricity**
Part 6 **Material and matter**
Part 7 **Time**

3a — 969 0 10096 3 — Rs. 40.00
Part 1 **Human beings**
Part 2 **Healthcare and safety**
Part 3 **Animals**
Part 4 **Sound**
Part 5 **Magnetism**
Part 6 **More about animals**

4a — 969 0 10098 X — Rs. 40.00
Part 1 **Human beings**
Part 2 **Healthcare and safety**
Part 3 **Living things and their needs**
Part 4 **Living things protect themselves**
Part 5 **Sound**
Part 6 **Magnetism**

5a — 969 0 10100 5 — Rs. 50.00
Part 1 **Human beings**
Part 2 **Healthcare and safety**
Part 3 **Animals**
Part 4 **Sound**

3b — 969 0 10097 1 — Rs. 40.00
Part 1 **Light and colour**
Part 2 **Plants**
Part 3 **Heat energy**
Part 4 **Light energy**
Part 5 **Force and energy**
Part 6 **Materials and matter**
Part 7 **Earth and atmosphere**
Part 8 **Time**

4b — 969 0 10099 8 — Rs. 40.00
Part 1 **Colours**
Part 2 **Plants**
Part 3 **Heat and temperature**
Part 4 **Electricity**
Part 5 **Time**

5b — 969 0 10101 3 — Rs. 50.00
Part 1 **Plants**
Part 2 **Animals**
Part 3 **Force and motion**
Part 4 **Heat and electricity**
Part 5 **Matter**
Part 6 **Earth and atmosphere**
Part 7 **Time**

(Prices are subject to change without notice)

Also under publication: Available in 1994

Ferozsons Primary English
Ferozsons Primary Mathematics
Ferozsons Primary Atlas.

FEROZSONS (Pvt) LTD.

LAHORE RAWALPINDI KARACHI

Lahore: 60, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Phones: 301196-98 Fax: 6278816
Rawalpindi: 277, Peshawar Road, Rawalpindi, Phone: 563503 Fax: 564273
Karachi: 1st Floor, Mehran Heights, Main Clifton Road, Karachi,
Phones: 570527 570524 537730 Fax: 57[illegible]